میرے بھی ہیں کچھ خواب

امجد اسلام امجد

میرے بھی ہیں کچھ خواب

میرے بھی ہیں کچھ خواب

امجد اسلام امجد

جہانگیر بکڈپو اُردو بازار ○ لاہور

جہانگیر بُک ڈپو۔ اُردو بازار، لاہور

ناشر ...... فواز نیاز
مطبع ...... نیاز جہانگیر پرنٹرز، لاہور
قیمت ...... 300 روپے
سٹاکسٹ ...... جہانگیر بکس، کمیٹی چوک
راولپنڈی، فون 539609

عاقب، روشین اور زیبندہ
کے نام

جن کے ناموں سے مل کر بننے والی نظم
اِس کتاب کی تمام نظموں سے زیادہ
خُوبصُورت ہے

نظمیں

سحر آثار

بارش کی آواز

اُس پار

ذرا پھر سے کہنا

فشار

ساتواں در

برزخ

نظمیں

کسی زندہ اور مسلسل لکھتے ہوئے شاعر کے سارے کلام کو ایک جگہ پر جمع کرنے اور پھر اُسے ایک یا ایک سے زیادہ جلدوں میں ایک ساتھ شائع کرنے کے لیے "کلیات" کی ترکیب پر اکثر اعتراض کیا جاتا ہے اور اگر شعری روایت کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ اعتراض خاصا وزن بھی رکھتا ہے کہ انگریزی کے Collected Works ہوں یا اُردو کا "کلیات" عام طور پر اس کا تصوّر شاعر کے اس دُنیا میں موجود نہ ہونے سے ہی وابستہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں جن زندہ شاعروں کے "کلیات" چھپے ہیں۔ اُنھوں نے ایسی کتابوں کو علیحدہ سے ایک نام دے دیا ہے تاکہ اس اعتراض سے بچا جا سکے۔ خود میں نے بھی اس راہ کو معقول اور آسان سمجھتے ہوئے اپنا مجموعی کلام "خزاں کے آخری دن" کے عنوان سے شائع کروایا ہے۔ پہلی اشاعت میں اس وقت تک کی شائع شدہ چار کتابیں شامل تھیں اور دوسری میں چھ۔ اسی طرح اگلے ایڈیشن میں مزید دو کتابیں "بارش کی آواز" اور "سحر آثار" شامل ہو جائیں گی اور یہ کلیات "یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید" کے مصداق، انشاء اللہ اُس وقت تک پھیلتا رہے گا جب تک لکھنے والے کی سانسیں سمٹ نہیں جاتیں۔

یہ کتاب اسی بیک وقت ادھوری اور مکمل تصویر کا ایک نیا روپ ہے کہ اس میں میرے تمام کلام میں سے نظموں کو علیحدہ کر لیا گیا ہے، زمانی ترتیب کے اعتبار سے یہ ایک ایسا Adventure ہے جس میں حال سے ماضی کی طرف سفر کیا گیا ہے گویا آپ میرے پہلے شعری مجموعے "برزخ" کی نظمیں سب سے آخر میں پڑھیں گے۔ ترتیب کے اس اُلٹ پھیر کی کوئی ایسی خاص وجہ یا ضرورت، اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ممکن ہے ایسا کرنے سے میری نظموں کے قارئین بھی شاید اُسی طرح کی انوکھی لذت اور دلچسپی محسوس کریں جیسی خود مجھ کو محسوس ہوتی ہے۔

پلٹنا جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

امجد اسلام امجد

نصرت فتح علی خاں کے لیے ایک نظم

خلا کی وسعتوں میں ہر گھڑی لاکھوں ستارے ٹوٹتے ہیں
اور فنا کا رزق بنتے ہیں
مگر آنکھیں!
ہماری آپ کی یہ کم نظر، کوتاہ بیں آنکھیں
نہ اُن کو دیکھ سکتی ہیں نہ اُن کو جان پاتی ہیں
بس اِتنا ہے
کہ کچھ ہونے کا اِک بے نام سا احساس رہتا ہے
ستاروں سے ہماری جانکاری بس یہیں تک ہے۔

مگر ایسا بھی ہوتا ہے
فضا میں دفعتاً اِک روشنی سی پھیل جاتی ہے
کوئی ایسا ستارہ ٹوٹتا ہے
جس کے ہونے سے
شبِ مہتاب کا اور آسماں کا حُسن قائم تھا
زمیں زادے اُسے جب دیکھتے تھے
اُن کی آنکھیں جگمگاتی اور منظر مسکراتے تھے
وہ اُس کو دیکھتے تھے اور چلنا بھول جاتے تھے
ابھی جو ٹوٹ کر بکھرا
وہ ایسا ہی ستارہ تھا
ہماری نصرت و فتح و ظفر کا استعارہ تھا

اُسے نغمے سلامی پیش کرتے اور "سرگم" اُٹھ کے ملتی تھی
اُسے وہ سُر بھی آتے تھے جنھیں سُن کر
فرشتے وجد کرتے اور ہوائیں جھوم اُٹھتی تھیں

یہ جتنے ساز ہیں

سب اس کی اُنگلی کے اشارے پر

ہمہ تن راگ بنتے تھے

جو رُوحوں میں سُلگ اُٹھے

اِک ایسی آگ بنتے تھے!!

ہم لوگ

دائروں میں چلتے ہیں!
دائروں میں چلنے سے
دائرے تو بڑھتے ہیں
فاصلے نہیں گھٹتے!

آرزوئیں چلتی ہیں!
جس طرف کو جاتے ہیں
منزلیں تمنّا کی
ساتھ ساتھ چلتی ہیں!

گرد اُڑتی رہتی ہے
درد بڑھتا جاتا ہے
راستے نہیں گھٹتے!

صُبح دم سِتاروں کی تیز جھلملاہٹ کو
روشنی کی آمد کا پیش باب کہتے ہیں!
اِک کرن جو ملتی ہے، آفتاب کہتے ہیں!
دائرہ بدلنے کو، انقلاب کہتے ہیں!

بارش کے رُوپ

ہیں ایک بارش کے رُوپ کتنے !

وہی ہے بادل ، وہی گھٹا ہے

یہ راز کیا ہے !

تمام قطرے زمیں پہ اِک ساتھ آ کے گرتے ہیں

پھر بھی سب ایک سے نہیں ہیں !

کہ جیسے نغمہ، بہت سے سازوں سے مِل کے بنتا ہے

اور پھر بھی

تمام سازوں کا اپنا اپنا الگ تشخص ہے

جیسے پیڑوں کے سبز پتّے

کہ سبز ہو کر بھی اپنی رنگت کے ایک حصّے میں

سارے پتّوں سے مختلف ہیں

کبھی جو بارش کی رُت میں آنکھوں کو بند کر کے
مَیں صرف اُس کی نئی نرالی صدائیں سُنتا
اور اُن میں بنتے طرح طرح کے سُروں کو چُنتا ہوں
ایسے لگتا ہے،
جیسے آہنگِ نو بہ نو کا کوئی دریچہ سا کھُل گیا ہو!!

شجر، سمندر، پہاڑ، وادی — ہَوا کی پائل
اُداس تنہا سڑک، بیاباں کی ریت، ساحل!
مکان — اُن کی چھتیں، دریچے اور اُن کے چھجّے
گلی کی جانب کو کھُلنے والی ہر ایک کھڑکی اور اُس کے شیشے .... !!

ہر ایک شے سے برستے بادل کی گفتگو کا مزا جُدا ہے
نیا ہے الفاظ کا چناؤ، نرالی بندش، نوا جُدا ہے
ہر اک سے باتیں الگ الگ ہیں
ہر اِک سے لہجہ جُدا جُدا ہے،

گھنی اُداسی کی برف جیسے
لہُو کے اندر پگھل رہی ہے!
چراغِ اُمّید کے جَلو میں
ہَوا جُدائی کی چل رہی ہے!
فضا میں وعدے بِکھر رہے ہیں
اور آگ، پانی میں جل رہی ہے!!

درد پھیل جائے تو

درد پھیل جائے تو
ایک وقت آتا ہے
دِل، دھڑکتا رہتا ہے
آرزو گزیدوں کے حوصلے نہیں چلتے
دشتِ بے یقینی میں آسرے نہیں چلتے،
رہروؤں کی آنکھوں میں
منزلیں نہ جب تک ہوں، قافلے نہیں چلتے۔!
اِک ذرا توجّہ سے دیکھئے تو کھُلتا ہے

لوگ اِن پہ چلتے ہیں، راستے نہیں چلتے !

سوچنے سمجھنے سے، ساتھ ساتھ چلنے سے

دُوریاں سمٹتی ہیں، فاصلے، نہیں چلتے

بخت ساتھ چلتا ہے، طالع آزماؤں کے

وقت رام کرنے میں، تجزیوں کے داؤ کیا !

تجربے نہیں چلتے

عِشق کے علاقے میں حُکمِ یار چلتا ہے

ضابطے نہیں چلتے

حُسن کی عدالت میں، عاجزی تو چلتی ہے

مرتبے نہیں چلتے

دوستی کے رشتوں کی پرورش ضروری ہے !

سلسلے تعلّق کے، خُود سے بن تو جاتے ہیں

لیکن ان شگوفوں کو ٹُوٹنے بکھرنے سے

روکنا بھی پڑتا ہے !

چاہتوں کی مٹی میں، آرزو کے پودوں کو

سینچنا بھی پڑتا ہے!

رنجشوں کی باتوں کو، بھُولنا بھی پڑتا ہے!!

کبھی یُوں بھی ہوتا ہے

کبھی یوں بھی ہوتا ہے

دو اجنبی دل

اچانک کسی خُوشنما موڑ پر

ایک دُوجے سے ملتے ہیں تو ایک لمحہ

اچانک کہیں سے اُبھرتا ہے

اور اُن کی آئندہ عمرُوں کے سارے مہ و سال

پر پھیلتے پھیلتے اُن کے چاروں طرف

اِک بظاہر دکھائی نہ دیتا ہُوا دائرہ سا بناتا ہے

جس کی حدیں گھیر لیتی ہیں اِک دن

ازل سے ابد تک کے سب فاصلوں کو !!

کبھی یوں بھی ہوتا ہے

دو ہم سفر جو ،

زمانوں پہ پھیلی ہوئی اِک مسافت

کو چاہت کے بادل کے سائے تلے

قدم در قدم کاٹتے جا رہے تھے ،

اچانک کسی اجنبی موڑ پر ایک لمحے کو رُکتے ہیں

تو دیکھتے ہیں

نجانے کدھر سے ہوائے جُدائی کا اِک تیز جھونکا

تعلّق کے سارے دِیوں کو بُجھاتا

دِلوں میں گِلوں کی فصیلیں اُٹھاتا ، بڑھا آ رہا ہے ،

اور اُس کی اُڑائی ہوئی گرد

لمحوں میں بے شکل کرتی

ہے عُمروں پہ پھیلے ہوئے فیصلوں کو !!

ہے کوئی نظر والا!

وہ چاند کہ روشن تھا سینوں میں نگاہوں میں،
لگتا ہے اُداسی کا اِک بڑھتا ہُوا ہالہ،
پوشاکِ تمنّا کو،
آزادی کے خلعت کو،
افسوس کہ یاروں نے
اُلجھے ہُوئے دھاگوں کا اِک ڈھیر بنا ڈالا!

وہ شور ہے لمحوں کا، وہ گھور اندھیرا ہے !

تصویر نہیں بنتی، آواز نہیں آتی !

کچھ زور نہیں چلتا، کچھ پیش نہیں جاتی !

اظہار کو ڈستی ہے ہر روز نئی اُلجھن

احساس پہ لگتا ہے ہر شام نیا تالہ،

ہے کوئی دلِ بینا ! ہے کوئی نظر والا !!

زیبندہ بیٹی کے لیے ایک نظم

بیس برس کی بات ہے لیکن یوں لگتا ہے
جیسے کل کی بات ہو، جب وہ
ننھے ننھے ہاتھ بڑھا کر مُجھ کو چھُوتی، میری جانب آتی تھی تو
اُس کے لبوں پر ایک ستارہ کھِلتا تھا،
میری رُوح کی ساری خُوشبو اور سچّائی
اُس کے لمس میں جاگ اُٹھتی تھی
اللہ — ! کیسے اچھے دن تھے!!

اب میں اُس کی پیاری پیاری
پھُولوں جیسی زیبندہ کو چھُوتا ہوں تو

یوں لگتا ہے

جیسے سب کچھ لوٹ آیا ہو

جیسے اُس نے میری خاطر

اپنا بچپن دوہرایا ہو !

مولا — جیسے تُو نے میری عرض سُنی اور

اپنے جاری فیض سے میرے من کو شانت رکھا

مُجھ پر اور اِک رحمت فرما

زیبندہ کو اُس کی ماں کی خُوشبو دے کر

عاقب اور روشین کی دُنیا

پہلے سے بھی روشن کر دے

اِس تازہ معصوم ہنسی سے

اُن کے سارے گھر کو بھر دے !!

خلافِ قانون

لوگ کہتے ہیں پانی میں لکڑی نہیں ڈوبتی !

اور وجہ یہ بتاتے ہیں

لکڑی کا اپنا حجم

چونکہ پانی کی اِتنی ہی مقدار کے

بالمقابل زیادہ نہیں !

اِس لیے وہ سدا

سطحِ آبِ رواں پہ رہے گی مگر

ڈوبنے کا عمل اُس پہ ہوگا نہیں

اَزل سے یہ قُدرت کا قانون ہے ،
اور قانونِ قُدرت بدلتا نہیں !!

یہ میں سوچتا ہوں
اگر یہ حقیقت میں قانون ہے
تو ترے غم کے دریا میں
دِل کیسے ڈوبا ؟

ساتھ تو اجنبی بھی چلتے ہیں

اُس نے مجھ سے کہا
مرے ساتھی !
تُم کو مجُھ سے جو ہے گِلہ — کیا ہے !
کبھی فرصت ملے تو یہ سوچو ،
منزلیں کیوں ہے ؟ فاصلہ کیا ہے ؟
اپنے اپنے سَفر پہ نِکلے لوگ
مشترک راستوں پہ چلتے ہیں
ہمرہی کے حصار میں جتنے

دِن نکلتے، چراغ جلتے ہیں !
سب کی آنکھوں میں جِھلملاتے ہیں
اپنی اپنی اُمید کے دَر و بام
زندگی کے سَفر میں ملتے ہیں
مستقل درد ، عارضی آرام !

تُم مِرے ہم سفر تو ہو لیکن
ہم کہیں سے بچھڑ بھی سکتے ہیں !
دیر تک اِک طویل رستے پر
ساتھ تو اجنبی بھی چلتے ہیں !!

آخرِ شب

کہیں نہیں ہے اِشارہ کسی بھی آہٹ کا
وہی ہے درد ، وہی انتظارِ آخرِ شب !

ہَوا گزُرتی ہے گلیوں سے شرمسار سی کچھ
کہ آج بھی کوئی خُوشبو نہیں وہ لاپائی !
ستارے دشتِ فلک میں بکھرتے جاتے ہیں
دِلوں میں پھیلتی جاتی ہے ایک تنہائی !

تنی ہے دائرہ در دائرہ وہ تاریکی ،
کِسی طرف کو کوئی راستہ نہیں جاتا !
زمیں سے کون کہے اب کہ ہم سے بات تو کر،
رگوں کو توڑ نہ ڈالے کہیں یہ سنّاٹا !!

کہیں سے صبح کی پہلی کِرن ملے، تو چلے
کھڑا ہے وقت سرِ رہگذارِ آخرِ شب !
کہیں نہیں ہے اشارہ کسی بھی آہٹ کا
وہی ہے درد ، وہی انتظارِ آخرِ شب !

اُلجھن

وہ ایک سوچا ہُوا ناز سا تکلّم میں
نظر میں ایک جھجک سی کوئی بنائی ہُوئی

لبوں پہ ایک تبسّم ذرا اِلجھایا سا
جبیں پہ بزمِ مروّت سجی سجائی ہُوئی

ڈھکا ڈھکا سا تکبّر وہ بات سُننے میں!
تھی جس میں حُسن کی نازش کہیں چھپائی ہُوئی

بدن میں خوف کی لرزش بھی، اور دعوت بھی!
گریز کرتی ہُوئی اور قریب آئی ہُوئی

کچُھ اُس کو دیکھ کے کھُلتا نہ تھا کہ کیا ہے وہ!
فریب دیتی ہُوئی یا فریب کھائی ہُوئی

اے ربّ غفّار !

ایک سوال کے اندر ہم نے کاٹی نصف صدی ،
باندھے لاکھ حساب ،
غلط ہی نکلا ہر اک حل کا لیکن انت جواب !

ضرب ، جمع ، تقسیم کے سارے گُلیے برت لیے
از رُوے تحقیق
ہر کوشش میں ہو جاتا ہے کچھُ نہ کچھُ تفریق

دیکھ تو کِتنا اُونچا ہے یہ ردّی کا انبار
تُو ہی اب کچھُ رحمت کر دے اے ربّ غفّار!

وہ دن اَب کچُھ دُور نہیں

وہ دن اب کچھ دُور نہیں ،

جب آپس میں کرنے والی سب باتیں بھی

انٹرنیٹ پر ہوں گی ،

جذبے ___ نقطوں اور لکیروں کی بولی میں بات کریں گے

لفظوں کی امداد لیے بن

اِک دُوجے کے خواب اور خدشے پڑھ پائیں گے ،

دھاگا دھاگا خاموشی سے اپنے گیت اور خواب بُنیں گے ،

خُوشبو دیکھیں ، رنگ سُنیں گے !!

وہ دِن اب کچھ دُور نہیں !

وقت سمندر کی لہروں میں تنہا تنہا چلنے والے

INTERNET ⁘

جسموں کی آواز کو سُن کر اِک دُوجے کی سَمت بہیں گے
پَل دو پَل کی وحشت میں اِک ساتھ رہیں گے
اور پھر ایسے ہو جائیں گے ،
جیسے یہ صحبت ہی اُن کے جیون بھر کا سرمایہ ہو
جس سے اگلے وقتوں والے
نسل ، قبیلے ، قوم وغیرہ کی پہچانیں کرتے تھے اور
مِل کر جیتے مرتے تھے !

وہ دن اب کچھ دُور نہیں !
ہر اک بات اُدھوری ہو گی
ایک ہی گھر کے دو کمروں میں
لاکھوں میل کی دُوری ہو گی
ردّی کا انبار سا ہوں گے جتنے رشتے ناتے ہیں
چاند نگر کی سیر کو خلقت ایسے آتی جاتی ہو گی
جیسے اب ہم بازاروں میں شاپنگ٭ کرنے جاتے ہیں

٭ SHOPPING

وہ دن اب کچھ دُور نہیں !

جب اِک سوچ اور ایک ہی جیسی شکلوں والے، آدم زادے

آدم زاد تو شاید ہوں گے

لیکن اُن کی شخصیت کے سارے جوہر

آنکھوں اور بالوں کی رنگت ،

خوشیاں ، محفل ، تنہائی ،

فکر ، تدبّر ، دانائی

شعر ، غنا ، تصویر

مستقبل میں آنے والے لمحوں کی تقدیر

سب کچھ اُن کے جینز* کے اَندر حسبِ ضرورت شامل ہوگا

ساری باتیں اَزبر ہوں گی ، ہر اِک فعل مکمّل ہوگا

وہ دن اب کچھ دُور نہیں !

اِنسانی جسموں کے اعضا ء

* GENES

فالتو پُرزوں کی صُورت میں شوکیسوں میں رکھے ہوں گے
(جینوئن بھی اور دو نمبر بھی)
تیسری دُنیا کے دل والے
پہلی دُنیا کے لوگوں کی آنکھیں اوڑھ کے نکلیں گے تو
سُورج اَندھا ہو جائے گا!
آقاؤں کے سینوں میں جب محکوموں کے دِل دھڑکیں گے
سب کچھ اُلٹا ہو جائے گا

وہ دن اَب کچھ دُور نہیں —!
جب آنکھوں سے اوجھل منظر بالکل صاف نظر آئیں گے!
آئینوں میں عکس کے بدلے نمبر جلتے بجھتے ہوں گے
لوگ مشینیں بن جائیں گے،
تخمینوں کے بیش و کم میں ہر اِک چیز اضافی ہو گی
جُرم بنیں گے پیار محبّت! دِل کی موت، تلافی ہو گی

GENIUNE :.

دُھند جمے گی سینوں میں اور برف اُگے گی پیڑوں پر
روبوٹوں سے ملتے جُلتے نقش بنیں گے چہروں پر
ایک ہی وقت میں جن کی آنکھیں
آگے پیچھے دیکھ سکیں گی
کان ، سمندر کے نیچے کی آوازیں پہچان سکیں گے
تاروں کے اُس پار ہے کیا کیا !
یہ بھی شاید جان سکیں گے!

وہ دن اب کچھ دُور نہیں — !
جب یہ سب کچھ "ہونے والا"
ہو جائے گا
رات ابھی تک باقی ہو گی اور اُجالا ہو جائے گا
ہر اِک خواب اور ہر اِک جذبہ ،
ماضی کے مرحوم دنوں کا ایک حوالہ ہو جائے گا۔
کل کے آدم کے ہاتھوں میں ہر اِک قفل کی کُنجی ہو گی
لمحے اُس کے چاکر ہوں ہر اِک ساعت باندی ہو گی

دستِ ہُنر کی فنکاری سے عقل کی روشن مشعل سے
دُنیا ویسی ہو جائے گی، جیسی اُس نے سوچی ہو گی!!
یہ تو سب کچھ ہو جائے گا، پھر بھی دل یہ کہتا ہے!
"یہ جو چاروں سمت ہمارے، وقت کا دریا بہتا ہے
کیا ہے اِس کے آگے پیچھے؟ کیوں ہے یہ اور کب سے ہے؟
کس کے حکم سے چلتا ہے اور کس کی کھوج میں رہتا ہے؟
جو کچھ ہم نے جان لیا ہے ــــ یہ تو ہے تحقیق!
اپنی اصل میں لیکن چیزیں کس کی ہیں تخلیق؟
کس نے کی ارزانی ہم کو یہ ساری توفیق؟
جس کا بھید نہ کھُل پائے وہ ایک سرا تو پھر بھی ہے!
اس ساری تعمیر میں یعنی ایک خلا تو پھر بھی ہے!
ہستی کے اس کھیل کے پیچھے، ایک خُدا تو پھر بھی ہے!!"

نظم

آندھیوں کی بے ٹھکانہ منزلوں میں
ریت ٹیلے ہو گئے
بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرتے کرتے
آپ نیلے ہو گئے

میں نے دیکھا اُسے

میں نے دیکھا اُسے ،
اجنبی سی کسی ایک محفل میں ، میری طرح
وہ بھی ہونٹوں پہ اِک بے اِرادہ تبسم سجائے ہُوئے
ایک کونے میں بیٹھی کبھی اپنے ناخن ،
کبھی سامنے نیم خالی پڑے جامِ مشروب کو
اور کبھی میز کی آڑ میں
اپنی نازک کلائی پہ باندھی ہُوئی وہ گھڑی دیکھتی تھی
جسے آگے چل کر ......
مگر یہ تو سب بعد کے واقعے ہیں

ابھی تو اُسے اِس تکلّف بھری اجنبی بزم میں
غالباً
میری موجودگی کی خبر، میرے ہونے کا احساس تک بھی نہ تھا!
میزباں تھا کوئی یا کوئی اور ہی مہرباں تھا!
کہ جس نے ہمیں ایک دُوجے کے نام
اور ان کے کناروں سے لپٹے ہُوئے کچھ حوالے بتائے
کسے یہ خبر تھی کہ اُس سرسری سے تعارف کا وہ
ایک پَل، ایک ایسے تعلق کی تمہید ہے
جو ہمارے . . . .
مگر یہ تو سب بعد کی بات ہے !

تو پھر یوں ہُوا
اپنی اپنی اُداسی کی شالوں میں لپٹے ہوئے، دیر تک
ہم وہیں ایک کونے میں بیٹھے رہے،

پھر کسی نے ڈنر کے لیے سب کو آواز دی
اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ، کھانا
بہت پُرتکلّف تھا اور میزبانوں
کے حُسنِ مدارات کے ساتھ اُن کے تموّل کا بھی ترجماں تھا، مگر
وہ کسی اور ہی سوچ میں دیر تک
اِک منقّش رکابی اُٹھائے ہُوئے ایستادہ رہی ،
میں نے اُس کے لیے
میز کے سامنے اِک جگہ سی بنائی اور اُس کی طرف
دوستانہ تبسّم سے دیکھا کہ وہ
آگے بڑھ کر رکابی میں کچھ ڈال لے !
اُس نے آدابِ محفل میں لپٹی ہُوئی
مُسکراہٹ سے مجھ کو نوازا مگر، آگے آئی نہیں ،
ایک لمحے کو جب میری اُس کی نگاہیں ملیں
تو مجھے یوں لگا ، جیسے وہ
اپنی ان خوشنما جھیل سی خواب آنکھوں میں

پھیلی اُداسی، . . . چھپاتے چھپاتے بہت تھک چُکی ہو

سُبز قہوے کے دَور اور اقبال بانو کی مسحُور کُن

دِل نشیں گائیکی سے مہکتی ہُوئی اُس فضا میں وہ یوں

بے تعلّق سی بیٹھی رہی، جیسے وہ اُس گھڑی،

واں پہ تھی ہی نہیں

میں نے اُس سے کہا، . . . . .

او خُدا! یہ تو پھر بعد کی بات ہے!

اُس گھڑی تو فقط میں نے چاہا کہ اُس سے کہوں

کچھ کہوں! اُس کو بتلاؤں

"اے اجنبی ہم نشیں

اس اُداسی کو کچھ دیر کے واسطے بھُول جا، مُسکرا

دیکھ، دُنیا میں غم کے سوا بھی بہت کچھ ہے، آنکھیں

فقط آنسوؤں کے لیے ہی نہیں خواب بھی

ان کی جاگیر ہیں !

دیکھ میری طرف !

مجھ سے بھی زندگی نے ہمیشہ۔ رقیبوں سا ہی

ایک رشتہ رکھا

میں نے بھی آج تک اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھی نہیں

سنگ و خشتِ تمنّا چُنے ہیں سدا

بخدا، کوئی تعمیر دیکھی نہیں !"

رات ڈھلنے لگی ،

اور آہستہ آہستہ کمرے سے مہمان گھٹنے لگے ،

میزبانوں کے ہونٹوں کے لفظ

الوداعی مصافحوں کی یکسانیت میں بکھرتے ہُوئے

اپنی گرمی سے محروم ہوتے گئے

اور باہر سے آتے ہوئے شور کی

دُور ہوتی صداؤں کے ہنگام میں

میزبانوں سے کچھ بات کرتے ہوئے

اُس نے دیکھا مجھے '۔ اُس کے ہونٹوں کے کونے ذرا کپکپائے

وہ جیسے کسی نیند میں مُسکرائی ،

چلی ، پھر رُکی ۔ رُک کے دیکھا مجھے !

ہاں یہی وہ نظر تھی

یہی وہ مقدر بداماں نظر تھی

جو میرے لیے ، صرف میرے لیے تھی

کہ جس میں اُلجھ کر

مری زندگی کی ،

مرے آنے والے شب و روز کی

اور مرے سارے خوابوں کی منزل نہاں تھی

زمان و مکان کے سبھی فاصلے

ایک پل کے لیے بے نشاں ہو گئے

اُسی اِک نظر میں دُھواں ہو گئے

پھر نہ میں تھا کہیں اور نہ کچھ اور تھا
بس ازل تا ابد ایک خوشبو رواں تھی
فقط وہ ___ وہاں تھی!

خدشہ

گزُرے لمحوں کی اُلجھی ہُوئی ڈور کے اُس طرف

خواب میرے جہاں دفن مٹی میں تھے

بارشوں نے وہاں گھاس اِتنی اُگا دی

کوئی رہنما سی علامت ، نشانی کوئی ، کچھ بچا ہی نہیں ،

کچھُ بچا ہی نہیں کہ کِسی یاد کی

کوئی اُلجھی ہُوئی اِک گرہ کھولتے !

وہ سِرا ڈھونڈتے !

ایک بھیدوں بھرا اور زمانوں پہ پھیلا ہُوا

وہ سِرا ڈھونڈتے

جو کہیں خواب اور اُس کی تعبیر کے درمیاں کھو گیا !

ہو چکی ہیں بہت، ہجر کی بارشیں
دن بہت جا چکے !
خواب میرے جہاں دفن مٹی میں ہیں
اب وہاں ہر طرف گھاس ہی گھاس ہے
اور اس گھاس میں سرسراتا ہُوا
سانپ سا ایک ڈر ہے ،
کہیں یہ نہ ہو !
ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ سِرا مل بھی جائے !
وہ گِرہ کھُل بھی جائے !
تو لمحوں کی اُلجھی ہُوئی ڈور کے اُس طرف
کچھُ نہ ہو — !!!"

کسی خُوش نگاہ سی آنکھ نے .....

کِسی خُوش نگاہ سی آنکھ نے یہ کمال مجُھ پہ کرم کیا
مری لوحِ جاں پہ رقم کیا
وہ جو ایک چاند سا حرف تھا وہ جو ایک شام سا نام تھا
وہ جو ایک پھُول سی بات پھرتی تھی دربدر
اُسے گلستاں کا پتا دیا
مِرا دل کہ شہرِ ملال تھا اُسے روشنی میں بسا دیا
مِری آنکھ اور مِرے خواب کو کسی ایک پَل میں بہم کیا۔
مِرے آئنوں پہ جو گرد تھی مہ و سال کی
وہ اُتر گئی
وہ جو دُھند تھی مِرے چار سُو وہ بکھر گئی
سبھی رُوپ عکسِ جمال کے
سبھی خواب شامِ وصال کے

جو غبارِ وقت میں سر بسر تھے اَٹے ہُوئے

وہ چمک اُٹھے

وہ جو پھُول راہ کی دُھول تھے، وہ مہک اُٹھے

لیے سات رنگ بہار کے

چلا میں جو سنگ بہار کے!

تو سجا دیئے سبھی راستے،

کسی دستِ شعبدہ ساز نے

مرے نام پر، مِرے واسطے!

مری بے گھری کو پناہ دی، مری جستجو کو نشاں دیا

جو یقین سے بھی حسین ہے مجھے ایک ایسا گماں دیا

وہ جو ریزہ ریزہ وجود تھا

اُسے اِک نظر میں بہم کیا

کسی خوش نگاہ سی آنکھ نے

یہ کمال مجھ پہ کرم کیا!!

اے راندگانِ خاک !!

اُٹھو زمین سے اے راندگانِ خاک، اُٹھو!
خُدا نے سر جو دیے ہیں، اُنھیں اُٹھا کے چلو
تمام سجدے بشر پر حرام ہوتے ہیں
(بس ایک سجدہ ہے جائز جو اُس کو زیبا ہے)
اُٹھو زمین سے اے کشتگانِ درد کہ اَب
وہ بے کسی کے زمانے تمام ہوتے ہیں !!

یہ بے بسی کے وظیفے — یہ عاجزی کے وِرد
اَزل سے آج تلک کِس کے کام آئے ہیں!
حقوق گرتے نہیں کاسۂ گدائی میں
کبھی نہ بھیک کے ٹکڑوں پہ نام آئے ہیں!
اُٹھو زمیں سے، اُٹھاؤ سروں کو، دیکھو تو!
تمھارے واسطے کیا کیا پیام آئے ہیں !!

بھلے دنوں کی توقع میں جاگتی آنکھیں
بکھر گئیں اِسی مٹّی میں انتظار کے بعد!
جو خواب دیکھے ہیں صدیوں تمھارے آبا نے
جو تم بھی دیکھتے جاؤ گے رات دن یوں ہی
تمھیں بھی خواب ہی واپس ملیں گے اور وہ بھی
بڑی اذیّت و ذلّت، بہت پُکار کے بعد!
سو اب جو دیکھو تو زندہ حقیقتیں دیکھو
کہ جن کے سائے میں تم کو حیات کرنی ہے
گزارنے ہیں یہیں پر تمام آتے دن!
یہیں تمھارے عزیزوں نے رات کرنی ہے!
ہے سرِّ حرمتِ آدم، زباں کی آزادی،
کرو اے بخت گزیدو جو بات کرنی ہے!!

اسلام آباد کی ایک سڑک

بُلند و بالا، وسیع و عریض، پُر ہیبت
یہ سنگ و خشتِ تراشیدہ سے بنے ایواں!
یہ جگمگاتی ہُوئی کھڑکیوں کے رنگِ رواں؛
وہ بُت کدے ہیں جہاں،

ہر اِک غرض کے لیے ایک دیوتا ہے الگ
سب اپنی اپنی مہارت میں مختلف ہیں مگر
ہے سب کی ایک سی صُورت، ہے سب کی ایک زباں
برائے خلقِ خدا سب ہیں یک دل و یکساں

جو کوئی غور سے دیکھے عجب تماشے ہیں!
کسی کے کام نہ آئیں یہ وہ دلاسے ہیں!
یہ لوگ پانی میں رکھے ہُوئے بتاشے ہیں!

یہیں پہ بٹتی ہے امن و سکون کی دولت!
یہیں شجاعت و صدق و صفا کے مکتب ہیں
یہیں پہ رہتا ہے اہلِ دُعا کا مستقبل
یہیں ہے عدل کی کرُسی، یہیں مناصب ہیں!
یہاں زمیں کا سِرا آسماں سے ملتا ہے
سوائے خیر کے، سب کچھ یہاں سے ملتا ہے!!

تمھیں مُجھ سے محبّت ہے

محبّت کی طبیعت میں یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے!
کہ یہ جتنی پرانی جتنی بھی مضبوط ہو جائے
اِسے تائیدِ تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے

یقیں کی آخری حد تک دِلوں میں لہلہاتی ہو!
نگاہوں سے ٹپکتی ہو، لہُو میں جگمگاتی ہو!
ہزاروں طرح کے دلکش، حسیں ہالے بناتی ہو!
اِسے اظہار کے لفظوں کی حاجت پھر بھی رہتی ہے

محبّت مانگتی ہے یوں گواہی اپنے ہونے کی

کہ جیسے طفلِ سادہ شام کو اِک بیج بوئے

اور شب میں بارہا اُٹھے

زمیں کو کھود کر دیکھے کہ پودا اب کہاں تک ہے!

محبّت کی طبیعت میں عجب تکرار کی خُو ہے

کہ یہ اقرار کے لفظوں کو سُننے سے نہیں تھکتی

بچھڑنے کی گھڑی ہو یا کوئی ملنے کی ساعت ہو

اسے بس ایک ہی دُھن ہے

کہو — "مجُھ سے محبّت ہے"

کہو — "مجُھ سے محبّت ہے

تمُھیں مجُھ سے محبّت ہے

سمندر سے کہیں گہری، ستاروں سے سِوا روشن

پہاڑوں کی طرح قائم، ہَواؤں کی طرح دائم

زمیں سے آسماں تک جس قدر اچھے مناظر ہیں
محبّت کے کنائے ہیں، وفا کے استعارے ہیں
ہمارے ہیں۔
ہمارے واسطے یہ چاندنی راتیں سنورتی ہیں
سُنہرا دن نِکلتا ہے
محبّت جِس طرف جائے، زمانہ ساتھ چلتا ہے "

(۲)

کچُھ ایسی بے سکُونی ہے وفا کی سرزمینوں میں
کہ جو اہلِ محبّت کو سدا بے چین رکھتی ہے
کہ جیسے پھُول میں خُوشبو، کہ جیسے ہاتھ میں پارا
کہ جیسے شام کا تارا
محبّت کرنے والوں کی سحر راتوں میں رہتی ہے
گُماں کے شاخچوں میں آشیاں بنتا ہے اُلفت کا!
یہ عینِ وصل میں بھی ہجر کے خدشوں میں رہتی ہے

محبّت کے مُسافر زندگی جب کاٹ چُکتے ہیں

تھکن کی کرچیاں چُنتے، وفا کی اُجرکیں پہنے

سمے کی رہگزر کی آخری سرحد پہ رُکتے ہیں

تو کوئی ڈوبتی سانسوں کی ڈوری تھام کر

دھیرے سے کہتا ہے،

"یہ سچ ہے نا ـــــ!

ہماری زندگی اِک دُوسرے کے نام لکھّی تھی!

دُھندلکا سا جو آنکھوں کے قریب و دُور پھیلا ہے

اِسی کا نام چاہت ہے!

تمھیں مجُھ سے محبّت تھی

تمھیں مجُھ سے محبّت ہے!!"

محبّت کی طبیعت میں

یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھّا ہے!

وہ فقط میرا ہی دِلدار نہ تھا

(دِلدار بھٹی کے لیے ایک نظم)

کِس کا ہمدرد نہ تھا، دوست نہ تھا، یار نہ تھا
وہ فقط میرا ہی دلدار نہ تھا

قہقہے بانٹتا پھرتا تھا گلی کوچوں میں
اپنی باتوں سے سبھی دَرد بُھلا دیتا تھا
اُس کی جیبوں میں بھرے رہتے تھے سکّے، غم کے
پھر بھی ہر بزم کو گُلزار بنا دیتا تھا۔

ہر دُکھی دل کی تڑپ
اُس کی آنکھوں کی لہو رنگ فضا میں گھُل کر
اُس کی راتوں میں سُلگ اُٹھتی تھی

میری اور اُس کی رفاقت کا سفر
ایسے گزُرا ہے کہ اب سوچتا ہُوں
یہ جو پچّیس برس
آرزو رنگ ستاروں کی طرح لگتے تھے
کیسے آنکھوں میں اُتر آئے ہیں آنسو بن کر!
اُس کو روکے گی کسی قبر کی مٹی کیسے!
وہ تو منظر میں بکھر جاتا تھا خُوشبو بن کر!
اُس کا سینہ تھا مگر پیار کا دریا کوئی
ہر دُکھی رُوح کو سیراب کیے جاتا تھا
نام کا اپنے بھرم اُس نے کچُھ ایسے رکھا
دلِ احباب کو مہتاب کیے جاتا تھا

کوئی پھل دار شجر ہو سرِ راہ ہے، جیسے
کسی بدلے، کسی نسبت کا طلبگار نہ تھا
اپنی نیکی کی مَسرّت تھی، اثاثہ اُس کا
اُس کو کچھ اہلِ تجارت سے سروکار نہ تھا

کس کا ہمدرد نہ تھا، دوست نہ تھا، یار نہ تھا
وہ فقط میرا ہی دلدار نہ تھا۔

تیرے میرے خواب

آسمان کے چاند اور تارے

تیرے میرے خواب نہ ہوں !

یہ جو فرشِ خاک پہ بکھرا ریزہ ریزہ آئینہ ہے

اِس میں جتنے عکس ہیں، سارے

تیرے میرے خواب نہ ہوں!

دیر رہیں جو آنکھوں میں تو خواب پرندے بن جاتے ہیں

لاکھ انھیں آزاد کرو یہ پھر کر واپس آ جاتے ہیں

یہ جو قفس کے دروازے میں پَر پھیلائے بیٹھے ہیں

یہ درماندہ ، اوگن ہارے

تیرے میرے خواب نہ ہوں !

پلکوں کی دہلیز سے لگ کر دیکھ رہے ہیں رستوں کو
مٹتی بنتی شکلوں کو اور جلتے بجھتے رنگوں کو
بوجھل چُپ اور اوجھل دُکھ کے سائے سائے بیٹھے ہیں
یہ بے چہرہ اور بے چارے
تیرے میرے خواب نہ ہوں !

بحرِ فنا میں مل جانے تک ملنے سے مجبور بھی ہیں
اِک دُوجے کے ساتھ بھی ہیں اور اِک دُوجے سے دُور بھی ہیں
لمحوں کے گرداب سفر میں جو چکرائے بیٹھے ہیں
یہ دونوں ـــــ دریا کے کنارے
تیرے میرے خواب نہ ہوں !!

ایک عجیب خیال

کسی پرواز کے دوران اگر
اِک نظر ڈالیں جو
کھڑکی سے اُدھر
دُور، تا حدِّ نگہ
ایک بے کیف سی یکسانی میں ڈوبے منظر
محوِ افسوس نظر آتے ہیں
کسی انجان سے نشّے میں بھٹکتے بادل
اور پھر اُن کے تلے
بحر و بر، کوہ و بیابان و دَمن
جیسے مدہوش نظر آتے ہیں
شہر خاموش نظر آتے ہیں

شہرِ خاموش نظر آتے ہیں لیکن ان میں
سینکڑوں سڑکیں ہزاروں ہی گلی کوچے ہیں
اور مکاں — ایک دُوجے سے جُڑے
ایسے محتاط کھڑے ہیں جیسے
ہاتھ چھُوٹا تو ابھی،
گِر کے ٹوٹیں گے، بکھر جائیں گے۔
اِس قدر دُور سے کچھ کہنا ذرا مشکل ہے
اِن مکانوں میں، گلی کوچوں، گزرگاہوں میں
یہ جو کچھ کیڑے مکوڑے سے نظر آتے ہیں
کہیں اِنساں تو نہیں!
وہی انساں — جو تکبّر کے صنم خانے میں
ناخُدا اور خُدا، آپ ہی بن جاتا ہے
پاؤں اِس طرح سرِ فرشِ زمیں رکھتا ہے
وُہی خالق ہے ہر اک شے کا، وُہی داتا ہے

اِس سے اب کون کہے !

اے سرِ خاکِ فنا رینگنے والے کیڑے !

یہ جو مستی ہے تجھے ہستی کی

اپنی دہشت سے بھری بستی کی

اس بلندی سے کبھی آن کے دیکھے تو کُھلے

کیسی حالت ہے تری پستی کی!

اور پھر اُس کی طرف دیکھ کہ جو

ہے زمانوں کا ، جہانوں کا خُدا

خالقِ اَرض و سما ، حیّ و صمد

جس کے دروازے پہ رہتے ہیں کھڑے

مثلِ دربان ، اَزل اور اَبد

جس کی رفعت کا ٹھکانہ ہے نہ حدّ ۔

اور پھر سوچ اگر

وہ کبھی دیکھے تجھے !!!

کوئی چاند چہرا کُشا ہُوا

کوئی چاند چہرا کُشا ہُوا
وہ جو دُھند تھی وہ بِکھر گئی
وہ جو حَبس تھا وہ ہَوا ہُوا

کوئی چاند چہرا کُشا ہُوا
تو سمٹ گئی
وہ جو تیرگی تھی چہار سُو
وہ جو برف ٹھہری تھی رُوبرُو
وہ جو بے دِلی تھی صدف صدف
وہ جو خاک اُڑتی تھی ہر طرف -

مگر اِک نگاہ سے جل اُٹھے
جو چراغِ جاں تھے بُجھے ہُوئے
مگر اِک سخن سے مہک اُٹھے
مِرے گُلستاں، مِرے آئنے
کسی خُوش نظر کے حصار میں
کسی خُوش قدم کے جوار میں

کوئی چاند چہرا کُشا ہُوا
مِرا سارا باغ ھرا ہُوا

پروین کے "گیتو" کے لیے ایک نظم

ہاں مری جان، مِرے چاند سے خواہر زادے!
بُجھ گئیں آج وہ آنکھیں کہ جہاں
تیرے سپنوں کے سِوا کچُھ بھی نہ رکھا اُس نے،
کتنے خوابوں سے، سرابوں سے اُلجھ کر گُزری
تب کہیں تجھ کو، ترے پیار کو پایا اُس نے
تو وہ "خُوشبو" تھا کہ جس کی خاطر
اُس نے اِس باغ کی ہر چیز سے "اِنکار" کیا
دشتِ "صد برگ" میں وہ خُود سے رہی محوِ کلام
اپنے رنگوں سے تری راہ کو گلزار کیا

اے مِری بہن کے ہر خواب کی منزل "گیتو"

رونقِ "ماہِ تمام"

سوگیا آج وہ اِک ذہن بھی مٹّی کے تلے

جس کی آواز میں مہتاب سفر کرتے تھے

شاعری جس کی اثاثہ تھی جواں جذبوں کا

جس کی توصیف سبھی اہلِ ہُنر کرتے تھے

ہاں مِری جان، مِرے چاند سے خواہرزادے

وہ جِسے قبر کی مٹّی میں دبا آئے ہیں

وہ تری ماں ہی نہ تھی

پُورے اِک عہد کا اعزاز تھی وہ

جس کے لہجے سے مہکتا تھا یہ منظر سارا

ایسی آواز تھی وہ

کس کو معلوم تھا "خوشبو" کے سَفر میں جس کو

مسئلہ پھُول کا بے چین کیے رکھتا ہے

اپنے دامن میں لیے
کُو بکُو پھیلتی اِک بات شناسائی کی
اِس نمائشں گہِ ہستی سے گُزر جائے گی
دیکھتے دیکھتے مٹی میں اُتر جائے گی
ایسے چُپ چاپ بِکھر جائے گی ۔

......کئی سال ہو گئے

خوابوں کی دیکھ بھال میں آنکھیں اُجڑ گئیں
تنہائیوں کی دُھوپ نے چہرے جلا دیئے
لفظوں کے جوڑنے میں عبارت بکھر چلی
آئینے ڈھونڈنے میں کئی عکس کھو گئے
آئے نہ پھر وہ لوٹ کے، اِک بار جو گئے

ہر رہگذر میں بھیڑ تھی لوگوں کی اِس قدر
اِک اجنبی سے شخص کے مانوس خدّوخال
ہاتھوں سے گِر کے ٹوٹے ہُوئے آئنہ مثال
جیسے تمام چہروں میں تقسیم ہو گئے
اِک کہکشاں میں لاکھ ستارے سمو گئے

وہ دن ، وہ رُت ، وہ وقت، وہ موسم، وہ سرخوشی
اے گردشِ حیات، اے رفتارِ ماہ و سال!
کیا جمع اس زمیں پہ نہیں ہوں گے پھر کبھی؟
جو ہم سفر فراق کی دلدل میں کھو گئے
پتّے جو گر کے پیڑ سے، رستوں کے ہو گئے

کیا پھر کبھی نہ لوٹ کے آئے گی وہ بہار!
کیا پھر کبھی نہ آنکھ میں اُترے گی وہ دھنک!
جس کے وُفورِ رنگ سے چھلکی ہُوئی ہَوا
کرتی ہے آج تک
اِک زُلف میں سجے ہُوئے پھُولوں کا انتظار!

لمحے زمانِ ہجر کے، پھیلے کچھ اِس طرح
ریگِ روانِ دشت کی تمثال ہو گئے

اس دشتِ پُر سراب میں بھٹکے ہیں اس قدر
نقشِ قدم تھے جتنے بھی، پامال ہو گئے
اب تو کہیں پہ ختم ہو رستہ گمان کا
شیشے میں دل کے سارے یقیں، بال ہو گئے
جس واقعے نے آنکھ سے چھینی تھی میری نیند
اُس واقعے کو اب تو کئی سال ہو گئے!!

ہَوا بُرد

مرے ہم سَفر
مرے جسم وجاں کے ہر ایک رشتے سے معتبر، مرے ہم سَفر
تجھے یاد ہیں ! تجھے یاد ہیں !
وہ جو قربتوں کے سُرور میں
تری آرزو کے حصار میں
مری خواہشوں کے وفور میں
کئی ذائقے تھے گھُلے ہُوئے
درِ گلستاں سے بہار تک
وہ جو راستے تھے، کھُلے ہُوئے!

سرِ لوحِ جاں،
کسی اجنبی سی زبان کے
وہ جو خُوشنما سے حروف تھے!
وہ جو سر خوشی کا غبار سا تھا چہار سُو
جہاں ایک دُوجے کے رُوبرو
ہمیں اپنی رُوحوں میں پھیلتی کسی نغمگی کی خبر ملی
کسی روشنی کی نظر ملی،
ہمیں روشنی کی نظر ملی تو جو ریزہ ریزہ سے عکس تھے
وہ بہم ہُوئے
وہ بہم ہُوئے تو پتہ چلا
کہ جو آگ سی ہے شرر فشاں مری خاک میں
اُسی آگ کا
کوئی اَن بُجھا سا نشان ہے، تری خاک میں!
اسی خاکداں میں وہ خواب ہے
جسے شکل دینے کے واسطے

یہ جو شش جہات کا کھیل ہے یہ رواں ہُوا
اسی روشنی سے "مکاں" بنا، اسی روشنی سے "زماں" ہُوا
یہ جو ہر گُماں کا یقین ہے !
وہ جو ہر یقیں کا گمان تھا !
اسی داستاں کا بیان تھا !

(۲)

کسی دھیان کے، کسی طاق پر، ہے دھرا ہُوا
وہ جو ایک رشتۂ درد تھا
مرے نام کا ترے نام سے،
تری صبح کا مری شام سے،
سرِ رہگذر ہے پڑا ہُوا وہی خوابِ جاں
جسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے واسطے
کئی لاکھ تاروں کی سیڑھیوں سے اُتر کے آتی تھی کہکشاں،
سرِ آسماں

کسی اَبر پارے کی اوٹ سے

اُسے چاند تکتا تھا رات بھر

مرے ہم سفر

اُسی رُخصتِ غم کو سمیٹتے

اُسی خوابِ جاں کو سنبھالتے

مرے راستے، کئی راستوں میں اُلجھ گئے

وہ چراغ جو مرے ساتھ ساتھ تھے، بُجھ گئے

وہ جو منزلیں

کسی اور منزلِ بے نشاں کے غبارِ راہ میں کھو گئیں

(کئی وسوسوں کے فشار میں شبِ انتظار سی ہو گئیں)

وہ طنابِ دل جو اُکھڑ گئی

وہ خیامِ جاں جو اُجڑ گئے

وہ سفیر تھے، اُسی داستانِ حیات کے

جو وَرق وَرق تھی بھری ہُوئی

مرے شوق سے ترے روپ سے

کہیں چھاؤں سے، کہیں دھوپ سے

(۳)

مرے ہم سفر، تجھے کیا خبر!
یہ جو وقت ہے کسی دُھوپ چھاؤں کے کھیل سا
اِسے دیکھتے، اِسے جھیلتے
مِری آنکھ گرد سے اَٹ گئی
مِرے خواب ریت میں کھو گئے
مِرے ہاتھ برف سے ہو گئے
مِرے بے خبر، ترے نام پر
وہ جو پُھول کِھلتے تھے ہونٹ پر
وہ جو دیپ جلتے تھے بام پر،
وہ نہیں رہے
وہ نہیں رہے کہ جو ایک ربط تھا درمیاں وہ بکھر گیا
وہ ہَوا چلی

کسی شام ایسی ہَوا چلی
کہ جو برگ تھے سرِ شاخِ جاں، وہ گرا دیئے
وہ جو حرف درج تھے ریت پر، وہ اُڑا دیئے
وہ جو راستوں کا یقین تھے
وہ جو منزلوں کے امین تھے
وہ نشانِ پا بھی مِٹا دیئے!
مرے ہم سفر، ہے وہی سفر
مگر ایک موڑ کے فرق سے
ترے ہاتھ سے مرے ہاتھ تک
وہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ
کئی موسموں میں بدل گیا
اُسے ناپتے، اُسے کاٹتے
مرا سارا وقت نکل گیا
تو مِرے سفر کا شریک ہے
میں ترے سفر کا شریک ہوں

یہ جو درمیاں سے نکل گیا
اُسی فاصلے کے شمار میں
اُسی بے یقیں سے غبار میں
اُسی رہگزر کے حصار میں
ترا راستہ کوئی اور ہے
مرا راستہ کوئی اور ہے۔

دِل کے آتشدان میں شب بھر

دل کے آتشدان میں شب بھر
کیسے کیسے غم جلتے ہیں !
نیند بھرا سنّاٹا جس دَم
بستی کی ایک ایک گلی میں
کھڑکی کھڑکی تھم جاتا ہے
دیواروں پر زرد کا کہرا جم جاتا ہے
رستہ تکنے والی آنکھیں اور قندیلیں بجُھ جاتی ہیں

تو اُس لمحے ،
تیری یاد کا ایندھن بن کر
شعلہ شعلہ ہم جلتے ہیں
دُوری کے موسم جلتے ہیں ۔

تُم کیا جانو ،
قطرہ قطرہ دل میں اُترتی اور پگھلتی
رات کی صحبت کیا ہوتی ہے !

"آنکھیں سارے خواب بُجھا دیں
چہرے اپنے نقش گنوا دیں
اور آئینے عکس بُھلا دیں
ایسے میں اُمّید کی وحشت
درد کی صُورت کیا ہوتی ہے !
ایسی تیز ہَوا میں پیارے ،

بڑے بڑے منہ زور دیئے بھی کم جلتے ہیں
لیکن پھر بھی ہم جلتے ہیں
ہم جلتے ہیں اور ہمارے ساتھ تمھارے غم جلتے ہیں
دل کے آتشدان میں شب بھر
تیری یاد کا ایندھن بن کر
ہم جلتے ہیں۔

ہم لوگ نہ تھے ایسے

ہیں جیسے نظر آتے
اے وقت گواہی دے
ہم لوگ نہ تھے ایسے
یہ شہر نہ تھا ایسا
یہ روگ نہ تھے ایسے

دیوار نہ تھے رستے ــ زندان نہ تھی بستی
آزار نہ تھے رشتے ــ خلجان نہ تھی ہستی
یوں موت نہ تھی سستی!

یہ آج جو صُورت ہے — حالات نہ تھے ایسے
یوں غیر نہ تھے موسم — دن رات نہ تھے ایسے

تفریق نہ تھی ایسی
سنجوگ نہ تھے ایسے
اے وقت گواہی دے
ہم لوگ نہ تھے ایسے

آنے والا کل

نصف صدی ہونے کو آئی
میرا گھر اور میری بستی
ظُلم کی اندھی آگ میں جل جل راکھ میں ڈھلتے جاتے ہیں
میرے لوگ اور میرے بچّے
خوابوں اور سرابوں کے اِک جال میں اُلجھے
کٹتے، مرتے، جاتے ہیں
چاروں جانب ایک لہُو کی دَلدل ہے
گلی گلی تعزیر کے پہرے، کوچہ کوچہ مقتل ہے

اور یہ دُنیا ___ !

عالمگیر اُخوّت کی تقدیس کی پہرے دار یہ دُنیا

ہم کو جلتے ، کٹتے ، مرتے ،

دیکھتی ہے اور چُپ رہتی ہے

زور آور کے ظلم کا سایا پَل پَل لمبا ہوتا ہے

وادی کی ہر شام کا چہرہ خُون میں لتھڑا ہوتا ہے

لیکن یہ جو خونِ شہیداں کی شمعیں ہیں

جب تک اِن کی لَویں سلامت !

جب تک اِن کی آگ فروزاں !

درد کی آخری حد پہ بھی یہ دل کو سہارا ہوتا ہے

ہر اک کالی رات کے پیچھے ایک سویرا ہوتا ہے!

فنا کی راہیں بقا کے رستوں کی ہم سفر ہیں

ہتھیلیوں پہ جو بیج کے نکلے ہیں
کیسے سر ہیں !
ہر ایک آندھی کے راستے میں جو معتبر ہیں
یہ کیا شجر ہیں !

یہ کیسا نشّہ ہے جو لہو میں سرور بن کر اُتر گیا ہے!
تمام آنکھوں کے آنگنوں میں یہ کیسا موسم ٹھہر گیا ہے!
وفا کی راہوں میں جلنے والے چراغ روشن رہیں ہمیشہ
کہ اِن کی لَو سے جمالِ جاں کا ہر ایک منظر سنور گیا ہے

گھروں کے آنگن ہیں قتل گاہیں، تمام وادی ہے ایک مقتل
چنار شعلوں میں گھر گئے ہیں سُلگ رہا ہے تمام جنگل
مگر ارادوں کی استقامت میں کوئی لغزش کہیں نہیں ہے
لہو شہیدوں کا کر رہا ہے جوان جذبوں کو اور صیقل

جو اپنی حُرمت پہ کٹ مرے ہیں
وہ سَر جہاں میں عظیم تر ہیں
لہُو سے لکھی گئیں جو سطریں
وُہی اَمر تھیں، وُہی اَمر ہیں

بارش

ایک ہی بارش برس رہی ہے چاروں جانب
بام و در پر ___ شجر حجر پر
گھاس کے اُجلے نرم بدن اور ٹین کی چھت پر
شاخ شاخ میں اُگنے والے برگ و ثمر پر،
لیکن اس کی دل میں اُترتی گُمگھم سی آواز کے اندر
جانے کتنی آوازیں ہیں ___ !!
قطرہ قطرہ دِل میں اُترنے، پھیلنے والی آوازیں
جن کو ہم محسوس تو کر سکتے ہیں لیکن

لفظوں میں دوہرا نہیں پاتے
جانتے ہیں، سمجھا نہیں پاتے
جیسے پت جھڑ کے موسم میں ،بس ہی پیڑ پہ اُگنے والے
ہر پتّے پر ایسا ایک سماں ہوتا ہے
جو بس اُس کا ہی ہوتا ہے
جیسے ایک ہی دُھن کے اندر بجنے والے ساز
اور اُن کی آواز ___
کھڑکی کے شیشوں پر پڑتی بوندوں کی آواز کا جادُو
رِم جھم کے آہنگ میں ڈھل کر سرگوشی بن جاتا ہے
اور لہُو کے خلیے اُس کی باتیں سُن لگ جاتے ہیں ،
ماضی ، حال اور مستقبل، تینوں کے چہرے
گڈ مڈ سے ہو جاتے ہیں
آپس میں کھو جاتے ہیں
چاروں جانب ایک دھنک کا پردہ سا لہراتا ہے
وقت کا پہیّہ چلتے چلتے ، تھوڑی دیر کو تھم جاتا ہے

(۲)

آج بہت دن بعد سُنی ہے بارش کی آواز
آج بہت دن بعد کسی منظر نے رستہ روکا ہے
رِم جھم کا ملبوس پہن کر یاد کسی کی آئی ہے
آج بہت دن بعد اچانک آنکھ یونہی بھر آئی ہے

(۳)

آنکھ اور منظر کی وسعت میں چاروں جانب بارش ہے
اور بارش میں، دُور کہیں اِک گھر ہے جس کی
ایک ایک اینٹ پہ تیرے میرے خواب لکھے ہیں
اور اُس گھر کو جانے والی کچھ گلیاں ہیں
جن میں ہم دونوں کے سائے تنہا تنہا بھیگ رہے ہیں
دروازے پر قفل پڑا ہے اور دریچے سُونے ہیں
دیواروں پر جمی ہُوئی کائی میں چُھپ کر

موسم ہم کو دیکھ رہے ہیں

کتنے بادل، ہم دونوں کی آنکھ سے اوجھل

برس برس کر گزر چکے ہیں!

ایک کمی سی،

ایک نمی سی،

چاروں جانب پھیل رہی ہے،

کئی زمانے ایک ہی پَل میں

باہم مِل کر بھیگ رہے ہیں

اندر یادیں سُوکھ رہی ہیں

باہر منظر بھیگ رہے ہیں

کوئی تصویر مکمّل نہیں ہونے پائی

اَب جو دیکھیں تو کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی
یہ شب و روز و مہ و سال کا پُر پیچ سفر
قدرے آسان بھی ہو سکتا تھا!
یہ جو ہر موڑ پہ کچُھ اُلجھے ہُوئے رستے ہیں
ان میں ترتیب کا اِمکان بھی ہو سکتا تھا!
ہم ذرا دھیان سے چلتے تو وہ گھر
جس کے بام و در و دیوار پہ ویرانی ہے!
جس کے ہر طاق میں رکھی ہُوئی حیرانی ہے!
جس کی ہر صُبح میں شاموں کی پریشانی ہے!
اِس میں ہم چین سے آباد بھی ہو سکتے تھے،

بخت سے امن کی راہیں بھی نکل سکتی تھیں
وقت سے صُلح کا پیمان بھی ہو سکتا تھا

(۲)

اب جو دیکھیں تو بہت صاف نظر آتے ہیں
سارے منظر بھی ، پسِ منظر بھی
لیکن اِس دیر خیالی کا صِلہ کیا ہو گا ؟
یہ تو سب بعد کی باتیں ہیں مِری جان ، انھیں
دیکھتے ، سوچتے رہنے سے بھلا کیا ہو گا ؟
وہ جو ہونا تھا ہُوا ____ ہو بھی چُکا
وقت کی لَوح پہ لِکھّی ہُوئی تحریر کے حرف
خطِ تنسیخ سے واقف ہی نہیں
بخت ، مکتب کے رجسٹر کی طرح ہوتا ہے
اپنے نمبر پہ جو "بیک" نہیں کہہ پاتے
اُن کا کچھ عُذر نہیں ___ کوئی بھی فریاد نہیں
یہ وہ طائر ہیں جنھیں اپنی نوا یاد نہیں

(۳)

لائنیں کٹتی رہیں لفظ بدلنے کے سبب
کوئی تحریر، مسلسل نہیں ہونے پائی
حاصلِ عمُر — یہی چند ادھورے خاکے!
کوئی تصویر، مکمّل نہیں ہونے پائی۔

فرق

کہا اُس نے دیکھو،
"اگر یہ محبّت ہے، جس کے دو شالے
میں لپٹے ہُوئے ہم کئی منزلوں سے گزر آئے ہیں!
دھنک موسموں کے حوالے ہمارے بدن پہ لکھّے ہیں!
کئی ذائقے ہیں،
جو ہونٹوں سے چل کر لہُو کی روانی میں گھُل مِل گئے ہیں!

تو پھر اُس تعلق کو کیا نام دیں گے؟
جو جسموں کی تیز اور اندھی صدا پر رگوں میں مچلتا ہے
پوروں میں جلتا ہے

اور ایک آتش فشاں کی طرح

اپنی حدّت میں سب کچھ بہاتا ہُوا ــــــ سنسناتا ہُوا

راستوں میں فقط کچھ نشاں چھوڑ جاتا ہے

(جن کو کوئی یاد رکھتا نہیں)

تو کیا یہ سبھی کچھ،

اُنھی چند آتش مزاج اور بے نام لمحوں کا اِک کھیل ہے؟

جو ازل سے مری اور تری خواہشوں کا

انوکھا سا بندھن ہے ــــــ ایک ایسا بندھن

کہ جس میں نہ رسّی نہ زنجیر کوئی،

مگر اِک گرہ ہے،

فقط اِک گرہ ہے کہ لگتی ہے اور پھر

گرہ در گرہ یہ لہو کے خَلیّوں کو یُوں باندھتی ہے

کہ اَرض و سَما میں کشش کے تعلّق کے جتنے مظاہر

نہاں اور عیاں ہیں،

غلاموں کی صُورت قطاروں میں آتے ہیں

نظریں جُھکائے ہوئے بیٹھ جاتے ہیں
اور اپنے رستوں پہ جاتے نہیں
بات کرتے نہیں،
سر اُٹھاتے نہیں۔"

کہا میں نے، جاناں!
"یہ سب کچُھ بجا ہے
ہمارے تعلق کے ہر راستے میں
بدن سنگِ منزل کی صُورت کھڑا ہے!
ہوس اور محبّت کا لہجہ ہے یکساں
کہ دونوں طرف سے بدن بولتا ہے۔!
بظاہر زمان و مکاں کے سفر میں
بدن ابتدا ہے، بدن انتہا ہے
مگر اس کے ہوتے ___ سبھی کچُھ کے ہوتے
کہیں بیچ میں وہ جو اِک فاصلہ ہے!
وہ کیا ہے!

مری جان، دیکھو

یہ موہوم سا فاصلہ ہی حقیقت میں

ساری کہانی کا اصلی سِرا ہے

(بدن تو فقط لوح کا حاشیہ ہے)

بدن کی حقیقت، محبّت کے قصّے کا صرف ایک حصّہ ہے

اور اُس سے آگے

محبّت میں جو کچھ ہے اُس کو سمجھنا

بدن کے تصوّر سے ہی ماورا ہے

یہ اِک کیفیت ہے

جسے نام دینا تو ممکن نہیں ہے، سمجھنے کی خاطر بس اِتنا سمجھ لو

زمیں زادگاں کے مقدّر کا جب فیصلہ ہو گیا تھا

تو اپنے تحفّظ، تشخّص کی خاطر

ہر اک ذات کو ایک تالہ مِلا تھا۔

وہ مخصوص تالہ، جو اک خاص نمبر پہ کُھلتا ہے لیکن

کسی اور نمبر سے ہِلتا نہیں۔

تجھے اور مجھے بھی یہ تالے مِلے تھے
مگر فرق اِتنا ہے دونوں کے کھُلنے کے نمبر وہی ہیں
اور ان نمبروں پہ ہمارے سوا
تیسرا کوئی بھی قفل کھُلتا نہیں۔
تری اور مری بات کے درمیاں
بس یہی فرق ہے!
ہوس اور محبّت میں اے جانِ جاں
بس یہی فرق ہے!!

مگراک ستارۂ مہرباں

کئی چاند دُھند میں کھو گئے
کئی جاگ جاگ کے سو گئے
مگر اِک ستارۂ مہرباں
جو گواہ تھا

سرِ شام سے دمِ صُبح تک

کِسی وصل رنگ سی رات کا
کِسی بے کنار سے لُطف کا
کسی مُشکبار سی بات کا

مرے ساتھ تھا،
مرے ساتھ ہے۔!!

ناممکن

آنکھوں کو کیسے مل سکے خوابوں پہ اختیار!
قوسِ قزح کے رنگ کہیں ٹھیرتے نہیں،
منظر بدلتے جاتے ہیں نظروں کے ساتھ ساتھ
جیسے کہ اِک دشت میں لاکھوں سراب ہوں
جیسے کہ اِک خیال کی شکلیں ہوں بے شمار!

ہَونی ۔ انہونی

بادل ہوں یا کہ دریا ، دونوں نہیں رُکیں گے
صحرا کی ریت یونہی بازوکُشا رہے گی !
موسم ہو یا کہ لمحہ ، دونوں نہیں رُکیں گے
بے چین منظروں میں بے کل دُعا رہے گی!
سپنا ہو یا کہ سایا ، دونوں نہیں رُکیں گے
رستوں میں ہاتھ ملتی پاگل ہَوا رہے گی!

آنکھیں مری ہوں یا ہو چہرا ترا اے جاناں
اس گردبادِ غم میں دونوں ہی خاک ہوں گے
دونوں نہیں رہیں گے!
لیکن یہ خاک اپنی اِس خاکداں سے اُٹھ کر
تاروں میں جا رہے گی
جو درد کے مسافر، آئیں گے بعد اپنے
اُن کے لیے وفا کا یہ راستہ رہے گی۔

عُمر بھر کی کمائی

وہ جو ایک خواب سی رات تھی
مرے بخت میں
یُونہی ایک پَل میں گزُر گئی
وہ گزُر گئی تو پتہ چلا
وہی ایک کام کی چیز تھی
مری زندگانی کے رَخت میں۔

سیلف میڈ لوگوں کا المیہ

روشنی مزاجوں کا کیا عجب مقدّر ہے
زندگی کے رستے میں، بچھنے والے کانٹوں کو
راہ سے ہٹانے میں،
ایک ایک تنکے سے آشیاں بنانے میں
خُوشبوئیں پکڑنے میں، گُلستاں سجانے میں
عُمر کاٹ دیتے ہیں۔
عمر کاٹ دیتے ہیں
اور اپنے حصّے کے پھُول بانٹ دیتے ہیں
کیسی کیسی خواہش کو قتل کرتے جاتے ہیں
درگزر کے گلشن میں اَبر بن کے رہتے ہیں
صَبر کے سمندر میں کَشتیاں چلاتے ہیں

یہ نہیں کہ اِن کو اِس روز و شب کی کاہش کا
کچھ صِلہ نہیں مِلتا !
مرنے والی آسوں کا خوُں بہا نہیں مِلتا !

زندگی کے دامن میں جس قدر بھی خوُشیاں ہیں
سب ہی ہاتھ آتی ہیں،
سب ہی مِل بھی جاتی ہیں
وقت پر نہیں ملتیں — وقت پر نہیں آتیں!
یعنی ان کو محنت کا اُجر مِل تو جاتا ہے
لیکن اِس طرح جیسے،
قرض کی رقم کوئی قسط قسط ہو جائے
اصل جو عبارت ہو "پس نوشت" ہو جائے

فصلِ گُل کے آخر میں پھُول ان کے کھِلتے ہیں
اِن کے صحن میں سُورج دیر سے نکلتے ہیں۔

شاعر

کیسے کاریگر ہیں یہ !
آس کے درختوں سے
لفظ کاٹتے ہیں اور سیڑھیاں بناتے ہیں !

کیسے باہُنر ہیں یہ !
غم کے بیج بوتے ہیں
اور دِلوں میں خُوشیوں کی کھیتیاں اُگاتے ہیں

کیسے چارہ گر ہیں یہ !
وقت کے سمندر میں
کشتیاں بناتے ہیں، آپ ڈوب جاتے ہیں۔

یا سمیع و یا بصیر

ہجومِ غم سے جس دم آدمی گبھرا سا جاتا ہے
تو ایسے میں
اُسے آواز پہ قابو نہیں رہتا
وہ اِتنے زور سے فریاد کرتا، چیختا اور بلبلاتا ہے
کہ جیسے وہ زمیں پر اور خُدا ہو آسمانوں میں

مگر ایسا بھی ہوتا ہے
کہ اُس کی چیخ کی آواز کے رُکنے سے پہلے ہی
خُدا کچھ اِس قدر نزدیک سے اور اس قدر
رحمت بھری مسکان سے اس کو تھپکتا اور اس کی بات سُنتا ہے
کہ فریادی کو اپنی چیخ کی شدّت،
صدا کی بے یقینی پر، ندامت ہونے لگتی ہے

ہَوا ہے آتشیں مزاج

ہَوا ہے آتشیں مزاج
بدل رہے ہیں سب رواج
بھٹک رہی ہے ، روشنی
ہُوا ہے ظُلمتوں کا راج
ہر ایک سانس قرض ہے
تمام زندگی ہے باج
وہ حبس کا منتظر تھا "کل"
اُسی کا مُنتظر ہے "آج"
نشے میں گُم ہیں تخت و تاج
ہَوا ہے آتشیں مزاج

وفا کا خُوں ہے ہر طرف
کسی جبیں پہ بَل نہیں
طَرح طرح کے تجزیئے
مگر کوئی عمل نہیں

سوال ہی سوال ہیں
کسی کے پاس حل نہیں
بکھر گئے ہیں پھُول سَب
کسی شجر پہ پھَل نہیں

نہ شرم ہے کوئی نہ لاج
ہَوا ہے آتشیں مزاج

جو پُل تھی سب کے بیچ میں
وہ رسم و راہ کھو گئی
سروں سے چھت سَرک گئی
ہر اِک پناہ کھو گئی

ترا جمال گُم ہُوا
مِری نِگاہ کھو گئی
وہ سانجھ کی جو ڈور تھی
وہ ہم سے آہ، کھوگئی
سُلگ رہا ہے سب سماج
ہَوا ہے آتشیں مزاج

ہم ایک دُوجے سے مِلتے تو کِس طرح مِلتے۔!

زمیں پہ آگ تھی تارے لہُو میں لتھڑے تھے
ہَوا کے ہاتھ میں خنجر تھا اور پھُولوں کی
پھٹی پھٹی ہُوئی آنکھوں میں ایک دہشت تھی
اِرادے ٹوٹتے جاتے تھے اور اُمیّدیں
حصارِ دشت میں، بِکھری تھیں اِس طرح، جیسے
نشان، بھٹکے ہُوئے قافلوں کے رہ جائیں

ہمارے پاس سے لمحے گزُرتے جاتے تھے
کبھی یقین کی صُورت، کبھی گماں کی طرح
اُبھرتا، ڈوبتا جاتا تھا وسوسوں میں دِل
ہوائے تند میں کشتی کے بادباں کی طرح

عجیب خوف کا منظر ہمارے دھیان میں تھا
سروں پہ دُھوپ تھی اور مہر سائبان میں تھا

چراغ بجھتے تھے لیکن دُھواں نہ دیتے تھے
نہیں تھی رات مگر رَت جگا مکان میں تھا!

حروف بھیگے ہُوئے کاغذوں پہ پھیلے تھے
تھا اپنا ذکر، مگر اجنبی زبان میں تھا

نظر پہ دُھند کا پہرا تھا اور آئینہ
کسی کے عکسِ فسوں ساز کے گُمان میں تھا

ہم ایک راہ پہ چلتے تو کِس طرح چلتے!
تری زمیں کسی اور ہی مدار میں تھی
مرا سِتارا کسی اور آسمان میں تھا
ہم ایک دُوجے سے ملتے تو کِس طرح ملتے!
سَمے کا تیز سمندر جو درمیان میں تھا۔

ایک اور دھماکہ ہونے تک

بس ایک دھماکہ ہوتا ہے
اور جیتے جاگتے اِنسانوں کے جِسم "گُتاوا[1]" بن جاتے ہیں
ایک ہی پَل میں
اپنے اپنے خوابوں کے انبار سے بوجھل کِتنی آنکھیں
ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں
اُن کے دِنوں میں آنے والی ساری صُبحیں کٹ جاتی ہیں
ساری شامیں کھو جاتی ہیں۔
لاشیں ڈھونڈنے والوں کی چیخوں کو سُن کر یوں لگتا ہے
انسان کی تقدیر، قیامت ہ،
جس کو اِک دن آنا تھا وہ آ پہنچی ہے۔

[1] بھینسوں کا چارا

مرنے والے مرجاتے ہیں
جیون کے اسٹیج پر اُن کا رول مکمّل ہو جاتا ہے
لیکن اُن کی ایگزنٹ پر یہ منظر ختم نہیں ہوتا

اِک اور ڈرامہ چلتا ہے
اخباروں کے لوگ بھڑکتی لیڈیں گھڑنے لگ جاتے ہیں
جن کے دَم سے اُن کی روزی چلتی ہے اور
ٹی وی ٹیمیں کیمرے لے کر آجاتی ہیں
تا کہ وژیول سَج جائے اور

اعلیٰ افسر
اپنی اپنی سیٹ سے اُٹھ کر رَش کرتے ہیں
ایسا ناں ہو حاکمِ اعلیٰ
یا کوئی اُس سے مِلتا جُلتا
اُن سے پہلے آ پہنچے
پھر سب مِل کر اس "ہونی" کے پس منظر پر
اپنے اپنے شک کی وضاحت کرتے ہیں اور

حاکمِ اعلیٰ یا کوئی اس سے مِلتا جُلتا
دہشت گردی کی بھرپُور مذمّت کرکے
مرنے والوں کی بیواؤں اور بچّوں کو
سرکاری امداد کا مژدہ دیتا ہے
اور چلتے چلتے ہاسپٹل میں
زخمی ہونے والوں سے کچھُ باتیں کرکے جاتا ہے
حزبِ مخالف کے لیڈر بھی
اپنے فرمودات کے اندر
کرُسی والوں کی ناکامی، نااہلی اور کم کوشی کا
خُوب ہی چرچا کرتے ہیں
گرجا برسا کرتے ہیں
اگلے دِن اور آنے والے چند دِنوں تک یہ سب باتیں
خُوب اُچھالی جاتی ہیں، پھر دھیرے دھیرے
اِن کے بدن پہ گرد سی جمنے لگتی ہے
اور سب کچھُ دُھندلا ہو جاتا ہے

خاموشی سے اِک سمجھوتہ ہو جاتا ہے

سب کچھ بھُول کے سونے تک !

ایک اور دھماکہ ہونے تک!!

کالا جادُو

میرا تمام فن ، مری کاوشں ، مرا ریاض
اِک نا تمام گیت کے مِصرعے ہیں جن کے بیچ
معنی کا ربط ہے نہ کسی قافیے کا میل
انجام جس کا طے نہ ہُوا ہو، اِک ایسا کھیل!

مری متاع ، بس یہی جادُو ہے عشق کا
سِیکھا ہے جس کو مَیں نے بڑی مشکلوں کے ساتھ
لیکن یہ سحرِ عشق کا تحفہ عجیب ہے
کھلتا نہیں ہے کچھ کہ حقیقت میں کیا ہے یہ!
تقدیر کی عطا ہے یا کوئی سزا ہے یہ!
کِس سے کہیں اے جاں کہ یہ قِصّہ عجیب ہے

کہنے کو یوں تو عشق کا جادُو ہے میرے پاس
پر میرے دِل کے واسطے اِتنا ہے اِس کا بوجھ
سینے سے اِک پہاڑ سا، ہٹتا نہیں ہے یہ
لیکن اَثر کے باب میں ہلکا ہے اِس قدر
تجھ پر اگر چلاؤں تو چلتا نہیں ہے یہ!!

بادل ــــ میں اور تم

بادل کے اور بحر کے رشتے عجیب ہیں!
کالی گھٹا کے دوش پہ برفوں کا رخت ہے
جتنے زمیں پہ بہتے ہیں دریا، سبھی کا رُخ
اِک بحرِ بے کنار کی منزل کی سمت ہے

خوابوں میں، ایک بھیگی ہُوئی خُوش دِلی کے ساتھ
ملتی ہے آشنا سے کوئی اجنبی سی موج
بادل بھنور کے ہاتھ سے لیتے ہیں اپنا رزق
پھر اس کو بانٹتے ہیں عجب بے رُخی کے ساتھ!
جنگل میں، صحن باغ میں، شہروں میں، دشت میں
چشموں میں، آبشار میں، جھیلوں کے طشت میں

گاہے یہ اوس بن کے سنورتے ہیں برگ برگ
گاہے کسی کی آنکھ میں بھرتے ہیں اِس طرح
آنسو کی ایک۔ بُوند میں دجلہ دِکھائی دے
اور دُوسرے ہی پَل میں جو دیکھو تو دُور تک
ریگِ روانِ دَرد کا صحرا دِکھائی دے!

بادل کے اور بحر کے جتنے ہیں سلسلے
مُجھ سے بھی تیری آنکھ کے رشتے' وہی تو ہیں!!

خُدا اور خلقِ خُدا

یہ خلقِ خُدا جو بکھرے ہُوئے
بے نام و نشاں پتّوں کی طرح
بے چین ہَوا کے رَستے میں گھبرائی ہُوئی سی پھرتی ہے
آنکھوں میں شکستہ خواب لیے
سینے میں دلِ بیتاب لیے
ہونٹوں میں کراہیں ضبط کیے
ماتھے کے دریدہ صفحے پر
اِک مہرِ ندامت ثبت کیے ٹھکرائی ہُوئی سی پھرتی ہے

اے اہلِ حشم اے اہلِ جفا!
یہ طبل و علَم یہ تاج و کُلاہ و تختِ شہی
اس وقت تمھارے ساتھ سہی

تاریخ مگر یہ کہتی ہے

اِسی خلقِ خدا کے ملبے سے اِک گُونج کہیں سے اُٹھتی ہے

یہ دھرتی کروٹ لیتی ہے اور منظر بدلے جاتے ہیں

یہ طبل و عَلم، یہ تختِ شہی، سب خلقِ خدا کے ملبے کا

اِک حصّہ بنتے جاتے ہیں

ہر راج محل کے پہلو میں اِک رستہ ایسا ہوتا ہے

مقتل کی طرف جو کُھلتا ہے اور بن بتلائے آتا ہے

تختوں کو خالی کرتا ہے اور قبریں بھرتا جاتا ہے

اکیسویں صدی کے لیے ایک نظم

سَمے کے رستے میں بیٹھنے سے
تو صرف چہروں پہ گرد جمتی ہے
اور آنکھوں میں خواب مرتے ہیں
جن کی لاشیں اُٹھانے والا کوئی نہیں ہے!

ہماری قسمت کے زائچوں کو بنانے والا کوئی ہو شاید
پر ان کا مطلب بتانے والا کوئی نہیں ہے!
وہ سارے رستے روائتوں کے کہ جن کی گرہیں کسی ہُوئی ہیں
ہمارے ہاتھوں سے اور پاؤں سے لے کے خوابوں کی گردنوں تک!
ہماری رُوحوں میں کھُبتے جاتے ہیں
اور ہم کو بچانے والا، چھڑانے والا کوئی نہیں ہے!

زباں پہ زنجیر سی پڑی ہے
دِلوں میں پھندے ہیں
اور آنکھوں میں شامِ زنداں کی بے کسی ہے
چراغ سارے بجھے پڑے ہیں جلانے والا کوئی نہیں ہے!

مرے عزیزو، مجھے یہ غم ہے
جو ہو چکا ہے بہت ہی کم ہے
سمے کے رستے میں بیٹھے رہنے کے دن بھی اب ختم ہو رہے ہیں
بچے کھچے یہ جو بال و پر ہیں
جو راکھ داں میں سُلگنے والے یہ کچھ شرر ہیں
ہمارے بچّوں کے سر چھپانے کو جو یہ گھر ہیں
اب ان کی باری بھی آ رہی ہے
وہ ایک مہلت جو آخری تھی

وہ جا رہی ہے ___
تو اس سے پہلے زمین کھائے

ہمارے جسموں کو اور خوابوں کو
اور چہروں پہ اپنے دامن کی اوٹ کر دے
یہ سرد مٹی جو بھُر بھُری ہے
ہماری آنکھوں کے زرد حلقے لہُو سے بھر دے !

مرے عزیزو چلو کہ آنکھوں کو مَل کے دیکھیں
کہاں سے سُورج نِکل رہے ہیں !
سمے کے رستے پہ چل کے دیکھیں ۔

خوابوں کو باتیں کرنے دو

آنکھوں میں جو خواب ہیں اُن کو باتیں کرنے دو
ہونٹوں سے وہ لفظ کہو جو کاجل کہتا ہے
موسم جو سندیسہ لایا اُس کو پڑھ تو لو
سُن تو لو وہ راز جو پیاسا ساحل کہتا ہے

آتی جاتی لہروں سے کیا پُوچھ رہی ہے ریت؟
بادل کی دہلیز پہ تارے کیونکر بیٹھے ہیں !
جھرنوں نے اُس گیت کا مُکھڑا کیسے یاد کیا !
جس کے ہر اِک بول میں ہم تُم باتیں کرتے ہیں

راہ گزر کا، موسم کا، نا بارش کا محتاج
وہ دریا، جو ہر اک دِل کے اندر بہتا ہے
کھا جاتا ہے ہر اِک شعلہ وقت کا آتش دان
بس اِک نقش "محبّت" ہے جو باقی رہتا ہے

آنکھوں میں جو خواب ہیں اُن کو باتیں کرنے دو
ہونٹوں سے وہ لفظ کہو جو کاجل کہتا ہے

یاد

اس موسم میں جتنے پھول کھلیں گے
اُن میں تیری یاد کی خوشبو ہر سُو روشن ہو گی
پتّہ پتّہ بھولے بسرے رنگوں کی تصویر بناتا گزرے گا
اِک یاد جگاتا گزرے گا

اِس موسم میں جتنے تارے آسمان پہ ظاہر ہوں گے
اُن میں تیری یاد کا پیکر، منظر منظر عُریاں ہو گا
تیری جھل مِل یاد کا چہرا رُوپ دکھاتا گزرے گا

اِس موسم میں

دِل دُنیا میں جو بھی آہٹ ہو گی
اُس میں تیری یاد کا سایا گیت کی صُورت ڈھل جائے گا
شبنم سے آواز مِلا کر کلیاں اُس کو دوہرائیں گی
تیری یاد کی سُن گُن لینے چاند مِرے گھر اُترے گا
آنکھیں پھُول بچھائیں گی
اپنی یاد کی خُوشبُو مجھ کو دان کرو اور اپنے دِل میں آنے دو
یا میری جھولی کو بھر دو یا مجھ کو مر جانے دو!!

آنکھیں

کیسے اُتروں پار !

بادل بادل تیری آنکھیں دریا دریا خواب

کیسے اُتروں پار !

چاروں جانب پھیل رہی ہے کاجل کی آواز

میرے دِل کی ویرانی کو اس کی سُندرتا سے بھر دے

مجھ پر اپنی پلکیں کر دے !

اَرض و سما کے رنگ محل میں جتنے منظر ممکن ہیں

تیری آنکھیں اُن میں ایسے جاگ رہی ہیں

جیسے دریاؤں کے سپنے
جن کی ہر تعبیر کے اندر ایک سمندر بہتا ہے

اے سُندر متوالی آنکھوں والی ناری سُن
اپنی آنکھیں مُوند کے مجُھ سے سپنے میرے لے لے
ان جھیلوں کے اندر کیا ہے ! اِس کا بھید بتا
اے سُندر متوالی آنکھوں، کجلے نینوں والی، تیرے رُوپ ہزار
بس اِتنا بتلا دے مجھ کو کیسے اُتروں پار !
بادل بادل آنکھیں تیری دریا دریا خواب ،
کیسے اُتروں پار بتا میں کیسے اُتروں پار !

خواب ٹوٹ جاتے ہیں

خواب ٹُوٹ جاتے ہیں
بھیڑ میں زمانے کی ،
ہاتھ چھُوٹ جاتے ہیں
درست دار لہجوں میں سلوٹیں سی پڑتی ہیں
اِک ذرا سی رنجش سے
شک کی زرد ٹہنی پر پھُول بدگمانی کے
اِس طرح سے کھلتے ہیں
زندگی سے پیارے بھی
اجنبی سے لگتے ہیں ، غیر بن کے ملتے ہیں

عُمر بھر کی چاہت کو آسرا نہیں ملتا
دشتِ بے یقینی میں راستہ نہیں ملتا
خامشی کے وقفوں میں
بات ٹوٹ جاتی ہے اور سرا نہیں ملتا
معذرت کے لفظوں کو روشنی نہیں ملتی
لذّتِ پذیرائی، پھر کبھی نہیں ملتی

پھُول رنگ وعدوں کی
منزلیں سُکڑتی ہیں
راہ مُڑنے لگتی ہے
بے رُخی کے گارے سے، بے دلی کی مٹّی سے
فاصلے کی اینٹوں سے، اینٹ جُڑنے لگتی ہے
خاک اُڑنے لگتی ہے
خواب ٹوٹ جاتے ہیں
واہموں کے سائے سے، عُمر بھر کی محنت کو

پَل میں ٹُوٹ جاتے ہیں
اِک ذرا سی رنجش سے
ساتھ چھُوٹ جاتے ہیں
بھیڑ میں زمانے کی
ہاتھ چھُوٹ جاتے ہیں
خواب ٹوٹ جاتے ہیں

اے میرے کشمیر

اے میرے کشمیر
اے ارضِ دلگیر
اپنے لہو سے تُو نے لکھّی جو روشن تحریر
بدلے گی اِک روز اِسی سے دُنیا کی تقدیر
اے میرے کشمیر ۔ اے اَرضِ دلگیر

شمعِ وفا کے پروانوں کے تجھ پر لاکھ سلام
ظُلم کی گہری کالی شب میں تُو ہے صبح امام
تُو نے جُہدِ حق کو دیا ہے ایسا ایک مقام
جس کی نہیں نظیر
آزادی وہ خواب کہ جس کی آزادی ، تعبیر
اے میرے کشمیر ۔ اے ارضِ دلگیر

لہو اُگلتی وادی سے گر تیل نکل آتا

پَل بھر میں ان اہلِ حشم کا رُوپ بدل جاتا

تیرا دُکھ اِک تیر کی صُورت اِن پر چل جاتا

اُٹھتے جاگ ضمیر

کِس نے کیا ہے، کون کرے گا، خُوشبو کو زنجیر!

اے میرے کشمیر۔ اے ارضِ دلگیر

تیرے لہو سے روشن ہے اب شمعِ وفا کی لَو

تو نے نئے عنوان دیے ہیں صبر اور ہمت کو

اللہ اور نبیؐ کی تجھ پر خاص عنایت ہو

ٹوٹے ہر زنجیر

بدلے گی اک روز تجھی سے دُنیا کی تقدیر

اے میرے کشمیر

اے ارضِ دلگیر

اِس گرد کے منظر نامے میں

تاریخ کی اُلجھی گلیوں میں
کچھ ڈھیر پڑے ہیں ملبے کے
ملبہ جو ہمارے درد کا ہے!
ہر دیکھنے والی آنکھ کا ہے
ہر سوچنے والے فرد کا ہے!
ہر منظر دُھندلا دُھندلا ہے
کچھ ایسا پردہ گرد کا ہے!!

وہ لوگ جو آگے گزر گئے
کیا سچ تھا اُن کا، جھوٹ تھا کیا!

کِس حق کی خاطر لڑتے تھے !

کِس ظلم کے ہاتھوں مرتے تھے !

کیا خواب تھے اُن کی آنکھوں میں !

اور کیا اُن کی تعبیریں تھیں ؟

جو سیلِ زماں کا رزق ہوئیں

وہ کیا محکم تعمیریں تھیں ؟

از زنگ جو ریزہ ریزہ ہُوا

کیا کیا اس میں تصویریں تھیں ؟

اور پانی پر جو لکھی گئیں

وہ کیا مشکل تحریریں تھیں !!

اِک دشت کی جلتی مٹّی پر

کیا بہتے لہُو نے لکھّا تھا !

پردیس کے قاتل رستوں میں

کیا مرتے ہوؤں نے سوچا تھا !

جو اہلِ حشَم کی صف میں گئے
محلوں میں تخت نشین ہُوئے
مفلس کے لہُو کے چھینٹوں سے
وہ دامن جو رنگین ہُوئے
اور خلقِ خُدا کی قِسمت کے
جو مالک بن کر بیٹھ گئے
لاشوں پر مسند رکھّی اور
پھر اُس پر تن کر بیٹھ گئے

اور وہ جو علم کے جَویا تھے
تاروں پہ کمندیں ڈالتے تھے
جو اپنی سوچ کے گلُشن میں
آفاق کے طائر پالتے تھے
ٹکسال میں فکرِ فردا کی
وجدان کے سِکّے ڈھلتے تھے

اور وہ جو عشق میں رُسوا تھے
جو مرزا ، رانجھن ، ہیر ہُوئے
خُود ڈھونڈا حُسن کے پھندے کو
پھر چل کر آپ اسیر ہُوئے
باطن میں اُتر کر حرفوں کے
جو غالبؔ ، خسرؔو ، میرؔ ہوئے !
یہ سب اور اِن سے اور کئی
اس سیلِ زماں کا رِزق بنے
اس گرد کے منظر نامے میں
اِک ابرِ گُماں کا رزق بنے

سب اپنی اپنی رَو میں ہیں
ہے کِس کو فرُصت ، کون رُکے !
کیا راز ہیں دل دروازوں کے ؟
اَب کون سنے اور کون کہے !

کچھ گھٹتی، مرتی چیخیں ہیں
کچھ لرزے ہوئے آوازے ہیں
کچھ خوف ہے پتھر بننے کا
کچھ ٹھٹھکے ہوئے اندازے ہیں
کچھ زخم ہیں جن کے نام نہیں
کچھ بھگتے ہوئے خمیازے ہیں
ترتیب ہو کیسے صفحوں کی!
سب بکھرے ہوئے شیرازے ہیں

مرغوں کی طرح اس ملبے میں
منقار دبا کر کیا ہو گا!
یہ روندے ہوئے سے تاج و کلاہ
ماتھوں پہ سجا کر کیا ہو گا!
جو نوحوں میں تبدیل ہوئے
وہ نغمے گا کر کیا ہو گا!

اگلوں کی جیت اور ہار سے ہم
کیوں خوش ہیں! کیوں شرمندہ ہیں!
ہے لوحِ جہاں پہ درج یہی
ہم آپ اپنا آئندہ ہیں
بس ایک حقیقت یاد رہے
جس سانس تلک ہم زندہ ہیں!
اُس پار کے منظر ڈوب چُکے
اِس پار کے پَل رخشندہ ہیں
وہ لوگ جو ہم سے پہلے تھے
اور وہ جو ابھی آئندہ ہیں
اس بیچ میں جو بھی وقفہ ہے
بس اُس کے ہم پابندہ ہیں
وہ جس ملبے کا رزق ہُوئے
ہم اُس ملبے میں زندہ ہیں

آؤ کہ چُنیں اس ملبے سے

جو خواب ابھی تابندہ ہیں

اُن جذبوں کی توقیر کریں

جو اَنمٹ ہیں، پائندہ ہیں

بس اُن تاروں کی بات کریں

جو بُجھ کر بھی رَخشندہ ہیں

اِس گرد کے منظر نامے میں

جو اپنے کہے سے رُک جائے

ایسا تو کوئی موسم بھی نہیں!

یہ سچ ہے آنکھ جھپکنے تک

منظر بھی نہیں اور ہم بھی نہیں!

اے بادِ فنا سے ڈرتے دِل

جو دیکھ سکے تو کم بھی نہیں!

یہ نظّارے کی فرصت بھی !
کچُھ کر سکنے کی طاقت بھی !
یہ پَل دو پَل کی مہلت بھی !!

دیکھو' جیسے' میری آنکھیں

یہ عُمر تمھاری ایسی ہے،
جب آسمان سے تارے توڑ کے لے آنا بھی
سچ مچ ممکن لگتا ہے!
شہر کا ہر آباد علاقہ
اپنا آنگن لگتا ہے
یوں لگتا ہے جیسے ہر دِن
ہر اک منظر
تم سے اجازت لے کر اپنی تشکل معیّن کرتا ہے!
جو چاہو وہ ہو جاتا ہے' جو سوچو' وہ ہو سکتا ہے!
لیکن اے اس کچّی عُمر کی بارش میں مستانہ پھرتی، چنچل لڑکی!
یہ بادل جو آج تمھاری چھت پر رُک کر تم سے باتیں کرتا ہے

اِک سایہ ہے ،

تم سے پہلے اور تمُھارے بعد کے ہر اِک موسم میں یہ

ہر اِک چھت پر ایسے ہی اور اسی طرح سے

دھوکے بانٹتا پھرتا ہے

صبحِ اَزل سے شامِ اَبد تک ! ایک ہی کھیل اور ایک ہی منظر

دیکھنے والی آنکھوں کو ہر بار دکھایا جاتا ہے

اے سپنوں کی سیج پہ سونے جاگنے والی پیاری لڑکی !

تیرے خواب جئیں ،

لیکن اِتنا دھیان میں رکھنا جیون کی اِس خواب سرا کے سارے منظر ،

وقت کے قیدی ہوتے ہیں جو ، اپنی رَو میں

ان کو ساتھ لیے جاتا ہے اور مہمیز کیے جاتا ہے

دیکھنے والی آنکھیں پیچھے رہ جاتی ہیں

دیکھو ___ جیسے ___ میری آنکھیں !!

میں نے ٹھیک کیا ہے، نا !!

کہتے ہیں جب گھر میں اچانک
ایسی آگ بھڑک اُٹھے
جو چشم زَدن میں
ہر اک شے کو اپنی موت لپیٹ میں لے لے،
آگ بجُھانا مشکل ہو اور
گھر کا اثاثہ اس سے بچانا ناممکن ___ تو
ایک ہی رستہ رہ جاتا ہے
جو بچتا ہو وہی بچاؤ !

گھر کی سب سے قیمتی چیزیں ہاتھ میں لو اور
اُس سے دُور نکل جاؤ

میرے دل میں بھی ایسی ہی آگ لگی تھی
میں نے جلدی جلدی آنکھ میں تیرے بُجھتے خواب سمیٹے
تیری یاد کے ٹکڑے چُن کر دھیان میں رکھے
اور اُس آگ میں دِل کو جلتا چھوڑ کے دُور نکل آیا ہوں
میں نے ٹھیک کیا ہے — نا !!

تو چل اے موسمِ گریہ

تو چل اے موسمِ گریہ، پھر اب کی بار بھی ہم ہی
تری انگلی پکڑتے ہیں تجھے گھر لے کے چلتے ہیں
وہاں ہر چیز ویسی ہے کوئی منظر نہیں بدلا
ترا کمرہ بھی ویسے ہی پڑا ہے، جس طرح تُو نے
اُسے دیکھا تھا، چھوڑا تھا
"ترے بستر کے پہلو میں رکھی اس میز پر اب بھی
دھرا ہے مگ وہ کافی کا
کہ جس کے خشک اور ٹوٹے کناروں پر
ابھی تک وسوسوں اور خواہشوں کی جھاگ کے دھبّے نمایاں ہیں

قلم ہے، جس کی نِب پر رَت جگوں کی روشنائی یوں لرزتی ہے

کہ جیسے سُوکھتے ہونٹوں پہ پپڑی جمنے لگتی ہے

وہ کاغذ ہیں

جو بے روئے ہُوئے کچُھ آنسوؤں سے بھیگے رہتے ہیں

ترے چپّل بھی رکھے ہیں

کہ جن کے بے ثمر تلووں سے وہ سب خواب لپٹے ہیں

جو اِتنا روندے جانے پر بھی اب تک سانس لیتے ہیں

ترے کپڑے،

جو غم کی بارشوں میں دُھل کے آئے تھے

مری الماریوں کے ہینگروں میں اَب بھی لٹکے ہیں

دلاسوں کا وہ گیلا تولیہ

اور ہچکیوں کا اَدھ گھُلا صابن

چمکتے واش بیسن میں پڑے ہیں اور

ٹھنڈے گرم پانی کی وہ دونوں ٹونٹیاں اب تک

رواں ہیں تو جنھیں اس دن

کسی جلدی میں چلتا چھوڑ آیا تھا

دریچے کی طرف دیوار پر لٹکی گھڑی

اب بھی، ہمیشہ کی طرح،

آدھا منٹ پیچھے ہی رہتی ہے

کِلنڈر پر رُکی تاریخ نے پلکیں نہیں جھپکیں

اور اس کے ساتھ آویزاں !!

وہ اِک منظر،

وہ اِک تصویر جس میں وہ

مرے شانے پہ سر رکھّے مرے پہلو میں بیٹھی ہے

مری گردن اور اس کے گیسوؤں کے پاس اِک تتلی

خُوشی سے اُڑتی پھرتی ہے

کچُھ ایسا سحر چھایا ہے

کہ دل رُکتا، ہَوا چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے "؛

مگر اے موسمِ گریہ،

اُسی ساعت

نجانے کس طرف سے تُو چلا آیا
ہمارے بیچ سے گُزرا
ہمارے بیچ سے تو اُس طرح گزرا
کہ جیسے دو مخالف راستوں کو کاٹتی سرحد
کہ جس کے ہر طرف بس دُوریوں کی گرد اُڑتی ہے

اُسی اِک گرد کی تہہ سی
تجھے دروازے کی بیل[1] پر جمی شاید نظر آئے
کوئی تصویر کے اندر کمی شاید نظر آئے
تمنّا سے بھری آنکھیں جو ہر دَم مُسکراتی تھیں
اب اُن آنکھوں کے کونوں میں نمی شاید نظر آئے

[1] BELL

تیرا نام

نہ تھی روشنی کسی آنکھ میں کسی خواب کی
یہ عجیب شامِ فراق تھی
لبِ بے نوا کے حصار میں کہیں ایک حرفِ دُعا نہ تھا
وہ فشار تھا مِری رُوح میں کہیں جیسے کوئی خُدا نہ تھا
فقط ایک چشمِ جمال نے مِرے کاخ و کُو کو بدل دیا
رہِ بے چراغ اُجال دی مِرے چار سُو کو بدل دیا

حبیب جالب کے لیے ایک نظم

سو گئیں مٹّی اوڑھ کے اب وہ آنکھیں، جن کے خواب
دُنیا بھر کے مظلوموں کے غم میں پلتے تھے
کھو گئے اَنت سمندر میں وہ روشنی رکھتے ہاتھ
جن کی اِک اِک پور لہُو میں ڈوبی رہتی تھی
بُجھ گئی وقت کے آتش داں میں وہ باغی آواز
جس کی ہر اک تان میں لاکھوں شعلے جلتے تھے

زنجیروں میں جکڑے پاؤں کیسے رقص کریں!
اُس کے استفسار کی شمع آج بھی روشن ہے
"ظلم رہے اور امن بھی ہو" یہ کیسے ممکن ہے؟

ظالم کے ہر ظُلم کے ردّ میں نظمیں لکھنے والا!
محکوموں کی آزادی کے نغمے بُننے والا!
خلقِ خُدا کے خوابوں کے گُلریزے چُننے والا!

جس آوارہ دیوانے کو جالبؔ کہتے تھے
ہستی کی اِس راہ گزر سے اب وہ جاتا ہے
اے مٹّی، اے ارضِ وطن، لے اپنی باہیں کھول
تیری جانب لوٹ کے تیرا شاعر آتا ہے

ہجر کے ماہتاب سُن

ہجر کے ماہتاب ، سُن

ہم بھی ہیں تیرے ہم سفر

ہم سے بھی کوئی بات کر

ہم تو ترے رفیق ہیں

ہم سے نہ اجتناب کر

دشتِ فراقِ یار میں

آزلوں کے ہم رکاب سُن

ہجر کے ماہتاب ، سُن

بخت میں جب نہ چین ہو
وقت سے کیا گِلہ کریں !
اُس سے کہاں ہِلا کریں !
راہ میں اُس کو روک لیں
کیسے یہ حوصلہ کریں !
تُو تو ہمارے ساتھ چل
تُو تو ہمارے خواب سُن
ہجر کے ماہتاب ، سُن

تاروں میں اِنتشار ہے
کِس کی نگاہ کے سبب !
اپنی ہی چاہ کے سبب
ہم نے جسے گنوا دیا
شدّتِ راہ کے سبب
اُس کے غمِ فراق کا
ہم سے کبھی حساب سُن
ہجر کے ماہتاب سُن

ہم سفر

تُمھارا نام کچھ ایسے مِرے ہونٹوں پہ کِھلتا ہے

اندھیری رات میں جیسے

اچانک چاند بادل کے کِسی کونے سے باہر جھانکتا ہے

اور سارے منظروں میں روشنی سی پھیل جاتی ہے

کلی جیسے، لرزتی اوس کے قطرے پہن کر مسکراتی ہے

بدلتی رُت، کِسی مانوس سی آہٹ کی ڈالی لے کے چلتی ہے

تو خُوشبو باغ کی دیوار سے روکے نہیں رُکتی

اِسی خُوشبو کے دھاگے سے مِرا ہر چاک سِلتا ہے

تُمھارے نام کا تارا مِری سانسوں میں کِھلتا ہے

تمھیں میں دیکھتا ہُوں جب سفر کی شام سے پہلے
کسی اُلجھی ہُوئی گُمنام سی چِنتا کے جادُو میں !
کسی سوچے ہُوئے بے نام سے لمحے کی خوشبو میں !
کسی موسم کے دامن میں، کسی خواہش کے پہلو میں !
تو اِس خُوش رنگ منظر میں تمھاری یاد کا رستہ
نجانے کِس طرف سے پھُوٹتا ہے
اور پھر ایسے مِری ہر راہ کے ہم راہ چلتا ہے
کہ آنکھوں میں سِتاروں کی گزر گاہیں سی بنتی ہیں
دھنک کی کہکشائیں سی
تُمھارے نام کے اِن خُوشنما حرفوں میں ڈھلتی ہیں
کہ جن کے لمس سے ہونٹوں پہ جُگنو رقص کرتے ہیں
تُمھارے خواب کا رشتہ مِری نیندوں سے مِلتا ہے
تو دِل آباد ہوتا ہے
مِرا ہر چاک سِلتا ہے
تمھارے نام کا تارا مِری راتوں میں کھِلتا ہے

دُوسرا رُخ

آنسو اب تک کس ہونی کو روک سکے ہیں ؟
کب تک ان کے ساتھ بہیں !
(جانے والی پیلی رُت میں کتنی گرد اُڑی !
کس نے کس کو کتنا کھویا ، کتنا یاد کیا !
تیز ہَوا کی سفّاکی نے کیا کیا کچھ برباد کیا !)
آؤ جو کچھ بیت چکا ہے اُس کو دفن کریں
گرتے پتّوں کی ڈھیری سے اپنے اپنے خواب چُنیں
اور یاد کریں وہ رنگلے موسم جن کو ابھی آنا ہے

اور گیت سُنیں اُن راہوں کے
جو دشتِ اَزل سے نکلی تھیں
اور جن کے ساتھ ہمیں بھی اپنے شہرِ ابد تک جانا ہے

آئندہ کے خواب ہی تو وہ سکّے ہیں جو
اَرض وسَما کی ہر بستی بازار میں چلنے والے ہیں
یہی دیئے ہیں جو آندھی کی راہ میں جلنے والے ہیں
خوابوں کی اِس بھیڑ سے آؤ
ہم تم اپنے خواب چُنیں
زخموں کی گنتی کو چھوڑیں
پھُول گِنیں۔!!

تمھیں میں کس طرح دیکھوں!

دریچہ ہے دھنک کا اور اِک بادل کی چلمن ہے
اور اس چلمن کے پیچھے، چھُپ کے بیٹھے
کچھُ ستارے ہیں، ستاروں کی
نگاہوں میں عجب سی ایک اُلجھن ہے
وہ ہم کو دیکھتے ہیں اور پھر آپس میں کہتے ہیں
"یہ منظر آسماں کا تھا یہاں پر کِس طرح پہنچا!
زمیں زادوں کی قسمت میں یہ جنّت کِس طرح آئی؟"

ستاروں کی یہ حیرانی سمجھ میں آنے والی ہے
کہ ایسا دلنشیں منظر کِسی نے کم ہی دیکھا ہے
ہمارے درمیاں اِس وقت جو چاہت کا مَوسم ہے

اُسے لفظوں میں لکھیں تو کتابیں جگمگا اُٹھیں
جو سوچیں اِس کے بارے میں تو رُوحیں گنگنا اُٹھیں

یہ تم ہو میرے پہلو میں
کہ خوابِ زندگی تعبیرِ کی صُورت میں آیا ہے ؟

یہ کِھلتے پھُول سا چہرا،
جو اپنی مُسکراہٹ سے جہاں میں روشنی کر دے
لہو میں تازگی بھر دے

بدن اِک ڈھیر ریشم کا
جو ہاتھوں میں نہیں رُکتا
انوکھی سی کوئی خُوشبو کہ آنکھیں بند ہو جائیں
سخن کی جگمگاہٹ سے شگوفے پھُوٹتے جائیں
چھُپا کاجل بھری آنکھوں میں کوئی راز گہرا ہے
بہت نزدیک سے دیکھیں تو چیزیں پھیل جاتی ہیں
سو میرے چار سُو دو جھیل سی آنکھوں کا پہرا ہے
تمھیں میں کِس طرح دیکھوں !!

بارش کی آواز

بارش کی آواز کو سُن کر

پیڑوں کی آغوش میں سہمی شاخیں جھومنے لگتی ہیں

گردِ ملال میں لپٹے پتّے جاگ اُٹھتے ہیں

اور ہوا کی پینگوں میں سرگوشیاں جھولنے لگتی ہیں

کھڑکی کے شیشوں پر جس دم پہلی بُوندیں پڑتی ہیں تو

بارش کی آواز گھروں میں خُوشبو بن کر دَر آتی ہے،

دُنیا کے، بے اَنت دُکھوں اور اندیشوں کی

اُڑتی مٹّی بیٹھتی ہے اور

بُجھے دِلوں کی اقلیموں میں شمعیں جلنے لگتی ہیں

راہیں چلنے لگتی ہیں

بارش کی آواز کو سُن کر

سپنوں کے آنگن میں رکھے بوجھ کی ڈھیری
ہولے ہولے کٹتی ہے تو سانسیں ہلکی ہو جاتی ہیں
رِم جھم کی آواز میں جیسے سب آوازیں کھو جاتی ہیں

بارش کی آواز کو سُن کر
جاگتی آنکھیں
سپنوں کی دہلیز سے اپنے ریزہ ریزہ خواب اُٹھانے
اور انھیں ترتیب میں لانے لگتی ہیں
مٹتی بنتی تصویریں پھر دھیان میں آنے لگتی ہیں
بارش کی آواز کو سُن کر !!

بوسنیا

تاریخ کی گلیوں میں مُسلم کا لہو اَرزاں
اِتنا نہ ہُوا ہوگا
دُشوار سہی لیکن بے برگ و شجر رستہ
اِتنا نہ ہُوا ہوگا

اے اشکِ سرِ مژگاں آنکھوں سے کنارا کر
آئینہ نما ہو جا

اے شمعِ شبِ تیرہ ، وہ صبح دوبارا کر

سینوں کی ضیا ہو جا

اِک حرفِ دُعا ہو جا

دُھندلایا ہُوا چہرا اِس ملّتِ بیضا کا

اِتنا نہ ہُوا ہو گا

تاریخ کی گلیوں میں مُسلم کا لہُو ارزاں

اِتنا نہ ہُوا ہو گا !!

کیوں ؟

ہر مَوج کے دامن میں بیدار جو دریا ہے !
اِک ریت کے ذرّے میں آباد جو صحرا ہے !
کیا اس کی وضاحت ہے! کیا اس کا تقاضا ہے!
جو سامنے آتا ہے، منظر ہے کہ پردہ ہے ؟

بے اَنت سوالوں کی زنجیر ہے یہ دُنیا
اُس عکس کے سایوں کی تصویر ہے یہ دُنیا
جس عکس کے جلوے کو ہر آنکھ ترستی ہے
ہے ایک گھٹا ایسی، کھُلتی نہ برستی ہے!

کیوں رنگ نہیں رُکتے! کیوں بات نہیں چلتی؟
کیوں چاند نہیں بُجھتا، کیوں رات نہیں جلتی؟

موسم کی صدا سُن کر کیوں شاخ لرزتی ہے!
کیوں اوس کفِ گل پر پَل بھر کو ٹھہرتی ہے!
کیوں خواب بھٹکتے ہیں! کیوں آس بِکھرتی ہے!
اس ایک تسلسل سے کیوں وقت نہیں تھکتا!
بس ایک تحیّر میں کیوں عُمر گزرتی ہے؟

محبّت کے موسم

محبّت کے موسم،
زمانے کے سب موسموں سے نرالے
بہار و خزاں ان کی سب سے جُدا
الگ ان کا سُوکھا، الگ ہے گھٹا
محبّت کے خِطّے کی آب و ہَوا
ماوراء، اُن عناصر سے جو
موسموں کے تغیّر کی بنیاد ہیں
یہ زمان و مکاں کے کم و بیش سے
ایسے آزاد ہیں

جیسے صبحِ اَزل — جیسے شامِ فنا
شب و روزِ عالم کے احکام کو
یہ محبّت کے موسم نہیں مانتے !
زندگی کی مُسافت کے انجام کو
یہ محبّت کے موسم نہیں مانتے !
رفاقت کی خُوشبو سے خالی ہو جو
یہ کوئی ایسا منظر نہیں دیکھتے ،
وفا کے علاوہ کسی کام کو
یہ محبّت کے موسم نہیں مانتے !

کوئی خُوشبُو بکھرتی ہے

کوئی خُوشبُو بکھرتی ہے
زمیں اور آسماں کے درمیاں، پھیلے مناظر میں
بہت آہستگی سے جب کوئی خوشبو بکھرتی ہے
تو آنکھوں میں ستاروں کا عجب میلہ سا لگتا ہے
ہَوا سرگوشیاں پہنے دریچوں سے گزرتی ہے
کوئی خُوشبُو بکھرتی ہے

درختوں سے جُدا ہوتے ہُوئے بے خانماں پتّے
سفر آغاز کرتے ہیں
تو سپنوں پر حقیقت کا کوئی پَرتو سا پڑتا ہے

صبا، قوسِ قزح کی راہ میں زینے بناتی ہے
اور اِک بے نام سی آہٹ دبے پاؤں اُترتی ہے
کوئی خُوشبُو بکھرتی ہے

نیا موسم، پرانے راستوں کی دُھول سے
چہرہ اُٹھاتا ہے
تو شبنم کاسۂ گل میں کئی سکّے گراتی ہے
زمیں پہلو بدلتی ہے
کوئی خُوشبُو بکھرتی ہے
بہت آہستگی سے پھر تری خُوشبُو بکھرتی ہے

اِتنے خواب کہاں رکھّوں گا!

اِتنے خواب کہاں رکھوں گا !
آنکھوں کے بازار میں تو اَب تِل دھرنے کی جگہ نہیں ہیں
اِتنے خواب کہاں رکھوں گا!

پلکوں کی چوکھٹ پہ کھڑے ہیں
بنتے مٹتے کیا کیا منظر
کِتنی اُمیدوں کے چہرے!
کتنے امکانوں کے پیکر!
ہاتھوں میں پھُولوں کے گجرے
پیروں میں خُوشبُو کی جھانجھر

لفظوں کے ریشم میں اُلجھے قوسِ قزح سے وعدے ہیں کچھ
جن کی لاکھوں گرہیں تیری ایک نظر سے کھُل جاتی ہیں
اور قطاریں باندھ کے آتی کچھ یادیں ہیں
جن کی گرد میں لپٹی راہیں ایک خبر سے دُھل جاتی ہیں
جیون ایک ترازو جس کے اِک پلڑے میں
تیرے وصل کا خواب رکھیں تو
دُنیا بھر کی ساری خوشیاں تُل جاتی ہیں

شام آئی ہے
تارا تارا جلتے بجھتے خواب لیے
پھر شام آئی ہے
ہر اک خواب کے سرنامے پر
اپنے جگمگ ہاتھ سے تُو نے
میرے نام کے حرف لکھے ہیں
اور مری آنکھوں کا قریہ

ان کی منزل درج کیا ہے

لیکن پیارے !

اَب کے پھر تُو تعبیروں کا خانہ بھرنا

بُھول گیا ہے !!

کوئی زنجیر ہو.....

کوئی زنجیر ہو ،
آہن کی ، چاندی کی ، روایت کی ،
محبّت توڑ سکتی ہے !

یہ ایسی ڈھال ہے جس پر
زمانے کی کسی تلوار کا لوہا نہیں چلتا !
یہ ایسا شہر ہے جس میں
کسی آمر ، کسی سُلطان کا سِکّہ نہیں چلتا !
اگر چشمِ تماشا میں ذرا سی بھی ملاوٹ ہو !
یہ آئینہ نہیں چلتا

یہ ایسی آگ ہے جس میں

بدن شعلوں میں جلتے ہیں تو رُوحیں مُسکراتی ہیں

یہ وہ سیلاب ہے جس کو

دِلوں کی بستیاں آواز دے کر خُود بُلاتی ہیں

یہ جب چاہے کسی بھی خواب کو تعبیر مِل جائے

جو منظر بُجھ چکے ہیں اُن کو بھی تنویر مِل جائے

دُعا، جو بے ٹھکانہ تھی، اُسے تاثیر مِل جائے

کسی رستے میں رستہ پُوچھتی تقدیر مِل جائے

محبّت روک سکتی ہے سمے کے تیز دھارے کو!

کِسی جلتے شرارے کو، فنا کے استعارے کو!

محبّت روک سکتی ہے، کسی گِرتے ستارے کو!

یہ چکنا چُور آئینے کی کرچیں جوڑ سکتی ہے

جدھر چاہے یہ باگیں موسموں کی موڑ سکتی ہے

کوئی زنجیر ہو، اُس کو محبّت توڑ سکتی ہے

یہ جو وقت ہے مِرے شہر پر

یہ جو وقت ہے مِرے شہر پر کئی موسموں سے رُکا ہُوا
اِسے اِذن دے کہ سفر کرے
اِسے حُکم دے کہ یہ چل پڑے، مِرے آسمان سے دُور ہو
کوئی چاند چہرہ، کشا کرے، کوئی آفتاب ظہُور ہو
کہ نواحِ چشمِ خیال میں وہ جو خواب تھے وہ دُھواں ہُوئے
وہ جو آگ تھی وہ نہیں رہی، جو یقین تھے وہ گُماں ہُوئے
کوئی دُھند ہے جسے دیکھتے، مِری آنکھ برف سی ہوگئی
وہ عبارتِ سرِ لوحِ دل، کسی ربط سے نہیں آشنا
کہ جو روشنی تھی کتاب میں وُہی حرف حرف سی ہوگئی

کوئی گردباد اُٹھے کہیں، کسی زلزلے کی نمود ہو
یہ جو "ہست" ہے مرے چارسُو، کوئی معجزہ کہ یہ "بُود" ہو

مری آنکھ میں یہ جو رات ہے، مری عُمر سی، اِسے ٹال دے
مرے دشتِ ریگِ ملال کو کسی خوش خبر کا غزال دے
یہ فلک پہ جتنے نجوم ہیں ترے حُکم کے ہیں یہ منتظر
وہ جو صبحِ نو کا نقیب ہو مری سمت اُس کو اُچھال دے!

کلنٹن ٹھیک کہتا ہے

کلنٹن ٹھیک کہتا ہے
کلنٹن جو بھی کہتا ہے، ہمیشہ ٹھیک کہتا ہے

اگر وہ یہ کہے،
"صدّام اک جنگلی درندہ ہے،
قذافی باؤلا ہے،
مشرقی یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے
اُس کے ڈانڈے روس کے ٹکڑوں سے ملتے ہیں

کہ جس کو سوشلسٹوں نے

نئی دُنیا کا اک سمبل بنایا تھا

جو اَب یہ خواب ٹوٹا ہے

تو اس کی کرِچیاں تکلیف تو دیں گی !

فلسطینی مہاجر بستیوں پر ظُلم جائز ہے

کہ اسرائیل کرتا ہے

مُسلمانوں کی سرکوبی بہت ہی لازمی ٹھہری

کہ فنڈامینٹلسٹوں نے بہت آفت مچائی ہے ،

یہ جتنا بوجھ ہے اِس تیسری دُنیا کے مُلکوں کا

اِسے مغرب کے کاندھے مفت میں کیونکر اُٹھائیں گے !

سو امریکی سفارت کار کی تعظیم لازم ہے

کہ اس کے مشورے کو جس کسی نے بھی نہ مانا ہے

وہ کوئی قوم ہو یا اُس کا کوئی سر پھرا لیڈر

اُسے بندا بنانا امنِ عالم کا تقاضا ہے"

یہ ورلڈ آرڈر کی اُس نے جو بساطِ نو بچھائی ہے

یہاں پر سب ہی مُہرے ہیں
کھلاڑی بس کلنٹن ہے کہ جو ہر چال چلتا ہے
کلنٹن ٹھیک کہتا ہے کہ یہ اُس کا زمانہ ہے
ہمیں تو بِل کلنٹن کو فقط اِتنا بتانا ہے
زمانہ اِس سے پہلے بھی کئی ہاتھوں سے گزرا ہے
زمانے نے تمھارے ہاتھ سے آگے بھی جانا ہے !

یہ لمحے اُس کے نام کریں

اک اور پڑاؤ آ پُہنچا،
جیون کے اس خواب سفر کی اور اک منزل ختم ہُوئی
شام و سحر کی بے معنی تقویم کے تھَل میں
پھیل رہی ہے،
نصف صدی کی ریت!
نصف صدی کی جلتی ریت پہ چاروں جانب
نقشِ کفِ پا بکھرے ہیں
جس جس راہ پہ میں نکلا ہوں
اور جدھر سے میری جانب لوگ چلے ہیں

ریت پہ سب کا حال لکھا ہے ،

ریت کے اس صحرا میں ملے ہیں

کیا کیا نخلستان !

اور سرابوں کے سایوں میں کتنی خاک اُڑی !

ریت پہ سب احوال لکھا ہے

نصف صدی کی جلتی ریت پہ

ہر لمحے کا حال لکھا ہے ___

(۲)

مجھے یاد ہے

تری داستانِ جمال میں وہ جو باب تھا

مرے ذکر کا

جو ورق ورق میں تھی روشنی

وہ جو رمز تھی گُلِ حرف میں

مرے شوق کی ، ترے ناز کی

مجھے یاد ہے ۔ مجھے یاد ہے

ترے پیرہن میں رچی ہُوئی
وہ مہک جو تیرے بدن کی تھی
مری جاں میں ہے جو بسی ہُوئی

مری پور پور میں درج ہیں
وہ جو حرف تیرے سخن کے تھے
مرے کُنجِ لب میں مقیم ہیں
وہ جو رنگ تیرے بدن کے تھے

وہ عجیب سے مہ و سال تھے
مگر ایک عصرِ وصال تھے
کبھی اَبر تھے، کبھی پُھول تھے
کبھی تتلیوں کی مثال تھے

مجُھے یاد ہے ـــ مجُھے یاد ہے
وہ کلام جو کہ نہ ڈھل سکا

کسی لفظ میں

یہ جو حرف حرف پڑھا گیا
کسی اور بات کے ذکر میں!
کسی اور چیز کے دھیان میں !
وہ کتاب جو کہ لکھی گئی
تری خامشی کی زبان میں !

مجھے یاد ہے، سرِ راہِ جاں
وہ چراغ سا، کسی آس کا
جسے آندھیاں نہ بُجھا سکیں
کہ وہ روشنی کی اساس تھا

وہ جو پہلے پہلے وصال پر
تری چشمِ خُوش میں رواں ہُوا
ترے ہجر کی شبِ تار میں
وہی جُگنوؤں کا سا قافلہ
مرے راستوں کا شریک تھا

وہ جو حرف تُو نے عطا کیے
مری زندگی کی کتاب کو
یہ تمام ربط اُنہی سے ہے
اُنہی موسموں کی ترنگ کا ہے جمال یہ
جو بہار میرے سخن میں ہے
اُنہی صحبتوں کی اُمنگ کا ہے کمال یہ
کہ جو حوصلہ سا تھکن میں ہے

(۳)

گماں آبادِ ہستی میں وُہی اک دُھوپ پھیلی ہے
بہم دیگر اُلجھتے، پھیلتے، بکھرے سوالوں کی!
مگر اَبرِ یقیں کا خُوشنما سایہ
نہ پہلے تھا ___ نہ اَب اُس کی
کوئی آہٹ،
کسی بھی سمت سے آواز دیتی ہے

کسی کی چُپ سوالوں کو نئے آغاز دیتی ہے

سمندر کی تہوں میں جو سفینے اَن گنت صدیوں

سے ڈُوبے ہیں

وہ کِس کو یاد کرتے ہیں !

جو پانی اُن کے ملبے کا امانت دار ٹھہرا تھا

اُنھیں کیسے بُلاتا ہے !

ہوا اُجڑے مکانوں کے دریچوں سے گزرتی ہے

تو کیا محسوس کرتی ہے !

ازل کیا ہے !

اگر وہ ہے تو اُس سے قبل کی تقویم کیسی تھی !

ابد کے جس کنارے کی طرف اپنے تئیں

ہم سب روانہ ہیں

کہاں ہے وہ !

اگر وہ ہے تو اُس کے بعد کی تفہیم کیسی ہو !

بہت ممکن ہے جو چیزیں بظاہر بننے والی ہیں
کبھی کی بن چکی ہوں
اور مستقبل
فقط اک خواب ہو جو خواب کی تجسیم لگتا ہے !!

زمیں اب تک ہزاروں مرتبہ
بس بس کے اُجڑی ہے کہ پہلی بار
یہ اس کھیل کا کردار ٹھہری ہے ؟
یہ نیلا آسماں
جو اک حصارِ بے اماں کی مثل چاروں اور پھیلا ہے ،
اگر اک استعارہ ہے کسی کی بے کرانی کا !
تو پھر اس مشتِ خاکی کی
بساطِ جستجو کیا ہے ؟
زمیں زادوں کی قسمت میں اگر مٹّی ہی لکھّی تھی ؟
تو پھر یہ ہاؤ ہُو کیا ہے ؟

زمیں کی بات نکلی ہے تو یاد آیا
یہ جتنے فاصلے ہیں
آدمی اور آدمی کے درمیاں
ان کی مُسافت میں لہو جتنا بھی بکھرا ہے
دلِ آدم سے نکلا ہے

یہ جتنی سرحدیں ہیں
زور و زر، رنگ و نسب، فضل و تمدّن کی
انھیں خود آدمی نے اپنے گِرداگِرد کھینچا ہے
یہ جتنے تفرقے حالات کے پیڑوں پہ اُگتے ہیں
سبھی کو اس چمن کے مالیوں نے آپ سینچا ہے،

ہوس کے اِک مسلسل خواب کی تعبیر ہے دُنیا
جسے تاریخ کہتے ہیں
یہ کچھ طاقت وروں کے ظلم کے قصّوں کا ملبہ ہے
غلاموں اور کنیزوں کے کہیں بازار لگتے ہیں

سگے بیٹوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیری جاتی ہیں
ہَوس میں تختِ شاہی کی
برادر اور برادر زادگاں دشمن ٹھہرتے ہیں
خُود اپنے ہاتھ سے گردن اُڑا دیتے ہیں
اُس کی بھی
کہ جس کا خُون ہوتے ہیں
ہر اِک رشتے کا حلقہ ایک پَل میں ٹوٹ جاتا ہے
مگر پھر بھی
مُورّخ ــــ امن، سُکھ اور چَین لکھتا ہے
(کہ آخر اُس مُورّخ کو بھی کُچھ دن اور جینا تھا)
درندوں سے بھرے جنگل کی اک تصویر ہے دنیا

مکانوں سے بھری اِن بستیوں کو غور سے دیکھا
تو یہ کیڑے مکوڑوں کی
پناہ گاہوں سے بدتر تھیں

کوئی دروازہ کھُلتا ہے

تو جیسے چیخ سی کوئی فضا میں پھیل جاتی ہے

گلی کوُچوں میں چلتے ہیں تو وحشت ساتھ چلتی ہے

کراہیں،

قہقہوں کی گوُنج میں آمیز ہوتی ہیں

تو سب چہرے

عجب بے چہرگی کا دل شکن منظر بناتے ہیں

کسی پہچان کی دُھن میں

یہ جب اعداد کی صُورت میں ڈھلتے ہیں

نہ ان کے نام رہتے ہیں، نہ اِن کے نقش بنتے ہیں

شکم کی بھُوک کی خاطر بدن نیلام ہوتے ہیں

اور اس کے بعد رُوحوں تک یہ قبضہ پھیل جاتا ہے،

پھر ایسی رات پڑتی ہے

کہ آنکھوں میں سحر تو کیا

سحر کے خواب تک باقی نہیں رہتے

(۴)

مِری عُمر کے یہ مہ و سال تو اِس
فشارِ زماں کے
کراں تا کراں پھیلتے دشت میں
ریت کے چند ذرّوں کی مانند ہیں جو
فنا کے بگولوں میں اُڑ جائیں گے
(خاک بن کر ہوا میں بکھر جائیں گے)
مگر یہ زمانہ ــــــ صدی بیسویں!
جس کے جاتے دِنوں کے گواہوں میں ہم ہیں
اِسے دیکھتے ہیں
تو اس کی نگاہیں جواباً پلٹ کر ہمیں دیکھتی ہیں
کہ جیسے یہ کہتی ہوں،
"اے اہلِ دُنیا
تُمھیں یہ خبر ہے

کہ کِن کِن ستاروں نے کب کب گُزرنا ہے
بامِ فلک سے !
اور آئندہ برسوں میں کیا کہکشائیں
تمھاری کمندوں کے حلقے میں ہوں گی !
تری اور خُشکی پہ جو کچھ نمایاں ہے
اِس کے علاوہ، تمھاری مشینیں
تہوں کی حقیقت کو بھی جانتی ہیں

مرے سو برس میں،
تمھاری رسائی میں وہ کچھ بھی آیا
کہ جس کا تصوّر بھی ممکن نہیں تھا
مری آستینوں میں وہ حیرتیں ہیں
کہ لاکھوں برس میں بھی یکجا نہ ہوں گی
مگر یہ بتاؤ کہ اس ساری تگ تگ میں
تم کو مِلا کیا ؟
تُمھارے دُکھوں میں کمی کوئی آئی !

سُلگتی ہُوئی بے اماں بستیوں کو
کہیں سے میسّر نمی کوئی آئی ؟

(۵)

جو کوئی دیکھے تو سب تماشہ
ہماری آنکھوں کے سامنے ہے
یہ وہ حقیقت ہے
جس کو چُھو کر پرکھ بھی سکتے ہیں
اور جس کی
صداقتوں سے مُفَر نہیں ہے

مگر نہ دل کو یقین آئے !
مگر نہ دل کو یقین آئے !
کہ ایک جانب اسی زمیں پر کروڑوں انسان مر رہے ہیں
شکم کے دوزخ نے اُن کو اپنی "طلب" کا ایندھن
بنا لیا ہے

اور اُس طرف یہ مہیب منظر
جو رِزق ان کو نہیں میسّر
اُسے جہازوں میں بھر کے ظالم سمندروں میں بہا رہے ہیں
بتا رہے ہیں
کہ اِس کی بازار میں "رسد" سے "طلب" کا میزاں خراب ہوگا
برس کے آخر میں جب کتابیں کلوز ہوں گی، حساب ہوگا،
تو اُس میں ہندسوں کی صرف ہندسوں کی بات ہوگی
کہ سارے بیجر فقط دماغوں کو جانتے ہیں
کسی بھی خانے کی روشنائی میں دل نہیں ہے

(٦)

جیون کے اس خواب سفر میں چلتے چلتے
آنکھیں تھکتی جاتی ہیں
کتنی باتیں، اک دُوجے میں گڈ مڈ ہو کر
کیا کیا رُوپ دکھاتی ہیں

نِصف صدی کا قصّہ اک ازرنگ کی صورت کھلتا ہے
تصویریں بنتی جاتی ہیں
اب تک جو کچھ بیت چکا
اور جو کچھ ہونے والا ہے
جیون کے اس خواب سفر کا
یہ دن ایک حوالہ ہے

اے دل، آ، اِس پُل پر رُک کر
تھوڑی دیر آرام کریں
جس نے "وقت" بنایا ہے
یہ لمحے اُس کے نام کریں

تو جو ہو گیا اُسے مان لے

کسی ہاتھ نے کسی لوح پر جو نہیں لکھا
وہی ایک حرفِ گماں ہیں ہم!
خطِ گمشدہ میں لکھی گئی
کوئی اجنبی سی زباں ہیں ہم!
کسی اور خطۂ درد پر جو گزر گیا
اُسی وقت کی تگ و تاز کا
کوئی بے نشاں سا نشاں ہیں ہم!
کبھی اپنے ہونے کے واہمے سے نکل کے دُنیا کو دیکھئے
تو نہ کھل سکے کہ کہاں ہیں ہم!

مری جاں ، ہماری یہ داستاں
اِسی آسمان کی چھت تلے
اِنہی کہکشاؤں کے درمیاں
کئی لاکھ بار کہی گئی کئی لاکھ بار سُنی گئی

یہ حدیثِ نغمۂ بے صدا
کبھی سُرخ پھُولوں کی تیز خوشبو میں رُک گئی
کبھی آنسوؤں میں رواں ہُوئی

یہ وہ شمعِ شامِ وصال ہے
جو تمام رات جلی کبھی
کبھی ایک پَل میں دُھواں ہوئی
کبھی روشنی کا یقیں بنی
کبھی تیرگی کا گُماں ہوئی

تو جو ہو گیا اُسے مان لے

کہ یہ داغ وہ ہیں جو سات بحروں

کے پانیوں سے نہ دُھل سکیں گے

کہ ایک تیرے نہ ماننے سے

یہ شہر بھر کی عمارتوں پہ

جو جلتے بجھتے حروف پہنے

شکستہ وعدے لٹک رہے ہیں

نہ جُڑ سکیں گے ، نہ چُھپ سکیں گے !

ہَوا کے رستے میں اُڑنے والے اُداس پتّے

نہ رُک سکے ہیں نہ رُک سکیں گے

تو جو ہو گیا اُسے مان لے

اب تم میرے نہیں رہے

میں جِس شہر میں رہتا ہوں
وہ کہتا ہے
"اب تم میرے نہیں رہے"

سانس جو اَب تک میری ہَوا میں تم نے لیے ہیں
لَوٹا دو
خواب جو میری مٹی کی خُوشبو میں جیے ہیں
دفنا دو
میرے رِزق کا لقمہ لقمہ
میرے جَل کا اِک اِک گھونٹ

میری فضا میں اُڑنے والے پنکھ پکھیرو
اور اُن کی خوش رنگ صدائیں
ان سب سے اب ہاتھ اُٹھاؤ اور سُنو
تیز ہَوا کی سائیں سائیں

میرے اُوپر تَنی ہوئی افلاک کی چادر
اَبر کے سائے، چاند کی کرنیں، روشن تارے
نہیں تمھارے!

میرے شہر اے میرے پیارے
اتنے کڑوے بول یہ تُو نے
کیسے سوچے! کیسے کہے!
''اَب تم میرے نہیں رہے''

——————

آبِ حیات

(۱)

آتے جاتے موسموں کی لَوح پر
رِلکھے ہَواؤں نے،
بہت سے لفظ ایسے
جن کے معنی، اب کسی کو بھی نہیں آتے
کہ وہ گزرے زمانوں کے کسی انجان دوراہے پہ
رستہ بُھول بیٹھے تھے،

نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہ ماضی میں تو زندہ ہیں
مگر کچُھ اِس طرح جیسے

مشینوں کے توسّط سے کوئی ''کومے'' میں زندہ ہو

کچھ ایسے لفظ بھی اِس لَوح پر لکھّے ہُوئے ہیں
جن کے معنی اب نہیں ظاہر
مگر اِک وقت آئے گا
کہ یہ مفہوم کی پوشاک پہنیں گے
بلند آواز میں بولیں گے اور باتیں کریں گے!

(۲)

کبھی کے مر چکے اور آنے والے لفظ میں کیسا یہ رشتہ ہے!
کہ دونوں ایک ہی لمحے میں زندہ بھی ہیں — مُردہ بھی،
ہمارا کام تو بس لَوح کی خالی جگھوں پر
حاشیوں کی بالکونی سے
انھیں آواز دینا ہے
کہ یہ اپنی جگہ پر آ کے بیٹھیں تو

ہماری بات بھی تحریر میں آئے !
ہمارے ہست کا منظر کسی تصویر میں آئے !

(۳)

ہمیں معلوم ہے اِک دِن
گزرتے وقت کی دیمک ہمیں بھی چاٹ جائے گی
کہ یہ اس کا وظیفہ ہے
یہ روشن دن جو نکلا ہے یہ آخر شام بھی ہو گا،
" وہ مہلت جو مِلی ہم کو، وہ کیسے بے ثمر نکلی!
وضاحت کون سنتا ہے !
تلافی کِس سے مانگیں ہم !"
ہمارے سر پہ اپنے خُون کا الزام بھی ہو گا۔
تو اس دیمک کا رِزقِ بے نشاں بننے سے پہلے
آخری حیلہ تو کر دیکھیں
جو کاغذ اپنے حِصّے کا ہے وہ کاغذ تو بھر دیکھیں

بہت مشکل سہی لیکن نہیں امکان سے باہر
کہ وہ الفاظ جن کے آج تک معنی نہیں ظاہر
ہم اُن کا بھید پا جائیں!
انھیں اِس لَوح پر لکھی ہُوئی تحریر کا حصّہ بنا جائیں،
اگر اُس موڑ سے پہلے،
جہاں اس بے جہت کاوش کو رزقِ خاک ہونا ہے
جہاں اِس زندگی کے قرض کو بے باق ہونا ہے
جہاں پر ہر بقا لمحہ، فنا پیغام بھی ہوگا
جہاں خورشید کا سایا شریکِ شام بھی ہوگا
اگر اُس موڑ سے پہلے
کسی صُورت،
ہم ان الفاظ کے پوشیدہ معنی جان پائیں تو
سمے کی لَوح پر لکھے ہُوئے کچھ خاص ناموں میں
ہمارا نام بھی ہوگا،
ہمارا کام بھی ہوگا۔

چلیں ہم فرض کرتے ہیں

یہ کیسا کھیل ہے تقدیر کی بے نام بازی کا
کہ جو ہارے، سو ہارے ہیں
مگر جو جیت جاتے ہیں
انھیں بھی اِک نئی اُلجھن کی دَلدل گھیر لیتی ہے
کہ اِک مشکل کے بعد اِک اور مشکل گھیر لیتی ہے

سمجھنے کے لیے آئیں،
چلیں ہم فرض کرتے ہیں !
"کسی لمحے کسی اِک شخص کو پانا ہماری زندگی سے بھی زیادہ بیش قیمت تھا

ہم اُس کی آرزو میں ساری دُنیا بھول بیٹھے تھے
بس اُس کا نام لیتے تھے، اُسی کو یاد کرتے تھے
اُسی کی دُھن میں جیتے تھے اُسی کے غم میں مرتے تھے
تو پھر کچھ یُوں ہوا اِک روز اُس کو پالیا ہم نے،
اُسے رنگوں کی ڈولی میں بٹھا کر گھر میں لے آئے
تصوّر کی ہر اِک خُوشبوئے گُل منظر میں لے آئے"

کہانی آگے چلتی ہے!

"تو ہوتا اِس طرح ہے۔ زندگی کے کارخانے میں
دِنوں کے آنے جانے میں
جہاں کے اَن گنت کاموں کا چکر چلنے لگتا ہے
بدن تھکتا ہے
آنکھیں دیر تک بیدار رہنے سے سُلگتی ہیں
زباں اِک تاجرانہ اور مسلسل جھُوٹ
کی تکرار سے اُکتانے لگتی ہے
مگر مجبور ہوتی ہے

کہ دنیا کا دباؤ اُس کو رُکنے ہی نہیں دیتا
کوئی بے کار سا قصّہ وہ پھر دوہرانے لگتی ہے
تھکن اور نیند کی مِلتی حدوں میں ، سرد بستر پر
سحر سے رات تک کی بے نتیجہ گفتگو
یاد آنے لگتی ہے

تو اُس لمحے
وہ عمروں کی ریاضت کا ثمر ، وہ گوہرِ یکتا
اُسی شکنوں بھرے بِستر کے اِک حصّے میں ہوتا ہے
مگر محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے وہ ہزاروں میل کی دُوری پہ رہتا ہے
اِسی دُوری کے صحرا میں کئی راتیں بکھرتی ہیں
کئی دن فوت ہوتے ہیں

تو پھر اِک دِن
کسی بے نام سے احساس کی آہٹ
ہمارے ہست کی خالی گلی میں گونجتی ہے

اور ہمیں بیدار کرتی ہے، بتاتی ہے
کہ ہم جس گھر میں رہتے ہیں
وہاں کچھ خوبصورت خواب بھی آباد ہوتے تھے"

چلیں ہم فرض کرتے ہیں
یہ سب کچھ اِک کہانی ہے،
مگر کتنی پرانی ہے!

کرو جو بات کرنی ہے

کرو جو بات کرنی ہے!
اگر اِس آس پہ بیٹھے، کہ دُنیا
بس تمھیں سُننے کی خاطر
گوش بر آواز ہو کر بیٹھ جائے گی
تو ایسا ہو نہیں سکتا۔،
زمانہ، ایک لوگوں سے بھرا فٹ پاتھ ہے، جس پر
کسی کو ایک لمحے کے لیے رُکنا نہیں ملتا،
بٹھاؤ لاکھ تم پہرے،
تماشا گاہِ عالم سے گزرتی جائے گی خلقت
بِنا دیکھے، بِنا ٹھہرے ___

جسے تم وقت کہتے ہو،
دھندلکا سا کوئی جیسے زمیں سے آسماں تک ہے!
یہ کوئی خواب ہے جیسے
نہیں معلوم کچھ اِس خواب کی مہلت کہاں تک ہے!
کرو، جو بات کرنی ہے۔!

بے وفائی کی مشکلیں

جو تُم نے ٹھان ہی لی ہے
ہمارے دِل سے نِکلو گے
تو اِتنا جان لو پیارے
وفا کی سیڑھیوں پر ہر قدم پھیلا ہوا
یہ آرزوؤں کا لہو ضائع نہ جائے گا
سمندر سامنے ہو گا اگر ساحل سے نِکلو گے !
ستارے، جن کی آنکھوں نے ہمیں اِک ساتھ دیکھا تھا،
گواہی دینے آئیں گے !
پرانے کاغذوں کی بالکونی سے بہت سے لفظ جھانکیں گے
تمھیں واپس بُلائیں گے،

کئی وعدے فسادی قرض خواہوں کی طرح رستے میں روکیں گے
تمھیں دامن سے پکڑیں گے
تمھاری جان کھائیں گے !
چُھپا کر کس طرح چہرہ
بھری محفل سے نکلو گے !
ذرا پھر سوچ لو جاناں ،
نکل تو جاؤ گے شاید
مگر مشکل سے نکلو گے !

———— ———

اے شعلۂ جاں، دیکھ

کِھلتے تھے جہاں چاند وہاں برف جمی ہے
تاروں سے تہی رات کی آنکھوں میں نمی ہے
کم کم ہیں دیئے اور بہت تیز ہَوا ہے
ہیں اہلِ ہوس رونقِ ایوانِ تمنّا
کانٹوں کا ہُوا رزق خیابانِ تمنّا
غنچے ہیں پریشان، گلوگیر صبا ہے
خوشبو کی زباں گنگ ہے، رنگوں کی نوا گُم
منزل تو بڑی بات ہے، رَستہ بھی ہوا گُم
آشوب ہے ایسا کہ نہ دیکھا نہ سُنا ہے

ہے دُور، بہت دُور کہیں صُبح کا تارا
معدوم سہی، دشتِ شبِ غم کا کنارا
لیکن یہی آشوب تو میزانِ وفا ہے!
اے دل یہ کڑا وقت ہی عرفانِ وفا ہے

اے شمعِ نظر، ضَو پہ تری حرف نہ آئے
اے شعلۂ جاں، دیکھ تری لَو نہ لرز جائے

شہر کے بے نشان رستوں میں

شہر کے بے نشان رستوں میں ڈھونڈتی پھر رہی ہے رات، کسے ؟
جو ہَوا سے اُلجھ رہا تھا کبھی
وہ دِیا تو دیارِ وحشت میں
آپ اپنی ضیا کا رزق ہُوا
وقت کے بے یقین صحرا میں
حیرتِ بے صدا کا رزق ہُوا

راستے اجنبی، فضا دشمن، ہم کہیں جا کے اب یہ بات، کسے!
کس نے کرنا تھا روشنی کا سفر، اور جلنا تھا کس کے ساتھ، کسے؟
شہر کے بے نشان رستوں میں، ڈھونڈتی پھر رہی ہے رات، کسے!

یکم جنوری ۱۹۹۰ء

ہر طرف دُھند ہے
دُھند ہی دُھند ہے
ایسے لگتا ہے جیسے زمیں آسماں
دُھند کے اس اجل خیز سیلاب میں
حار و خس کی طرح
بہتے بہتے کہیں دُور کھو جائیں گے
وہ مناظر جو گنتی میں آتے نہ تھے
ایک ہو جائیں گے!

بے یقینی کے رنگوں میں اُلجھی ہوئی
چاندنی درد کی، جگمگاتی نہیں!
دُھند کی جھیل پر تیرتی ہے مگر
راہ پاتی نہیں!
وہ نظر جو ستاروں کی ہمراز تھی
دس قدم دُور تک ساتھ جاتی نہیں
روشنی بھی کہیں کچھ دکھاتی نہیں!

آنکھ کہتی ہے، "باہر بہت دُھند ہے"
دل یہ کہتا ہے "اندر بھی کم تو نہیں!"

میں گیا تھا اُس گلی میں.....

میں گیا تھا اُس گلی میں کئی خواہشیں پہن کر

وہ جو تھیں بہت شناسا
اُنہی کھڑکیوں سے اب کے
کسی رُخ کی روشنی سے نہ چراغ کوئی لرزا
نہ کوئی ستارا چمکا، نہ ہی پھول کوئی آیا
دلِ منتظر کی جانب
نہ اُٹھائی کوئی چلمن کسی دستِ پُرحنا نے
نہ صبا کی دستکوں سے کوئی پردا سر سرایا

کسی خواب سے اُلجھ کر نہ تو چوڑیاں ہی چھنکیں
کسی آنکھ میں سمٹ کر نہ ہی چاند مُسکرایا

میں گیا تھا اُس گلی میں کئی خواہشیں پہن کر

ستارے ٹُوٹ کر جاتے کہاں ہیں

ستارے ٹُوٹ کر جاتے کہاں ہیں !
فلک کی شاخ سے جھڑتے ہوئے یہ اطلسی پتّے
زمیں کی سمت آتے ہیں تو اِن کی آخری سانسیں
دمکتی اور چمکتی روشنی کے
لہریوں کی شکل چلتی ہیں
بظاہر ایسا لگتا ہے
"وہاں"
بستی کے اُس جانب، کسی جنگل کی وسعت ہیں،
کسی پربت کے سینے پر
گِرا ہوگا کہیں ملبہ،
اُسی خوش رنگ تارے کا

جواب سے ثانیہ بھر قبل روشن تھا
چمکتا تھا، دمکتا تھا، فلک پر جگمگاتا تھا
(مگر اب اُس کے ہونے کی نشانی تک نہیں ملتی)

نظر حیران ہوتی ہے
کہ جو کوندا سا لپکا تھا
اُسے اب کِس طرح ڈھونڈے! کہاں ڈھونڈے!

خلا اندر خلا اِک خامشی ہے اور دہشت ہے
ستاروں کی گزر گاہوں میں بس وحشت ہی وحشت ہے!
نظر کے واہمے ہیں یا گماں ہیں!
کچھ نہیں کھُلتا
ستارے ٹوٹ کر جاتے کہاں ہیں!
کچھُ نہیں کھُلتا!!

جانِ جاں کیا کریں ؟

جان جاں کیا کریں ؟
”جو مہ و سال گزُرے ہیں اُن کو نہ گزرے ہوئے فرض کرلیں !
سمجھ لیں کہ موسم ابھی اپنے ہاتھوں سے نکلے نہیں
راستے، سُرخ پھُولوں سے مہکے ہوئے ہیں
ہوا، ساحلوں پر ہماری امانت سنبھالے ہوئے
چل رہی ہے، ستارے
ہمیں دیکھ کر مسکراتے ہیں
ہونٹوں پہ کِھلتے ہیں، آنکھوں میں سجتے ہیں
سانسوں میں چلتے ہوئے جگمگاتے ہیں !
یہ فرض کرلیں،
کہ لفظوں کے معنی ابھی تک وہی ہیں

تمنّا کے انداز بدلے نہیں ،

جو شب و روز گزرے ہیں — گزرے نہیں "

(۲)

کیا کریں جانِ جاں

جو عبارت ہواؤں پہ تحریر ہے

فرض کیسے کریں !

یہ جو لمحوں کی اُلجھی سی زنجیر ہے

اِس سے کیسے بچیں !

جو بھی کچھ ہو چکا — ہو چکا جانِ جاں ،

جو شب و روز تیری مری زندگی کے کناروں کو چھوتے ہوئے جا چکے

اُن کو ڈھونڈیں کہاں اور چھپائیں کہاں !

کیا کریں جانِ جاں — !

نارسائی کے صحرا میں جو کٹ گئے

وقت کی لوح پر اُن مہ و سال کا

ثانیہ ثانیہ ماجرا درج ہے!

گِرد بادِ زماں کے خم و پیچ سے
راستہ کوئی باہر کو جاتا نہیں!
خواہشوں کے بچھائے ہوئے جال میں
خواہشوں کے سوا کچھ بھی آتا نہیں!
جانِ جاں کیا کریں!
کیا کریں جانِ جاں!!

مُنیر احمد شیخ کے لیے کچھ پھُول

اے خدا ،

یہ ترا مال تھا تُو نے واپس لیا

ہم جو اس موسمِ گُل کی یادوں میں ہیں

تیرے دربار میں، سر جھکائے ہُوئے

کرتے ہیں التجا ،

اس لحد کے مکیں پر کُشادہ رہے

تیری رحمت سدا

اے خُدا ــــ اے خُدا

ایک سوگوار نظم

(مُنیر احمد شیخ کے لیے)

جتنے موسم ترے ساتھ گزرے
نجانے ترے واسطے اُن کی صورت ہے کیا!
جو تجھے یاد کرتے ہیں، اُن کے لیے
اب خزاں کے سوا کوئی موسم نہیں۔

کوئی کسی اور کے خوابوں میں کیسے زندہ رہ سکتا ہے!

یہ جان کر بھی

کہ سارے انساں بس اپنے خوابوں میں زندہ رہتے ہیں

اور اپنے اخیر دم تک اُنہی کے چہرے نکھارتے ہیں

انہی میں ہنستے، انہی میں بستے، انہی میں سجتے، سنوارتے ہیں

یہ جانتے ہیں

بہت ہی اچھی طرح سے یہ بات جانتے ہیں

کہ جس کی آنکھوں میں جتنے سپنے ہیں

اُس کے اپنے ہیں،

پھر بھی کیسا عجب ہے قصّہ

کہ ہر کوئی اپنے اپنے خوابوں کو، خواہشوں کو

کسی کی آنکھوں میں دیکھتا ہے

ہیں اپنے چہرے کے نقش جن کو

وہ اور چہروں میں ڈھونڈتا ہے ،

ہے باپ جو بھی ، وہ چاہتا ہے کہ اُس کا بیٹا

جہاں کو اپنی بجائے اُس کی نظر سے دیکھے

اور اُس آنکھوں میں خواب جتنے بھی گھر بنائیں

سبھی کے دروازوں کی جبیں پر

بس اُس کے حرفوں سے بننے والے اِک اسمِ دائم کی تختیاں ہوں

وہ اپنی آنکھوں سے "اُس" کی آنکھوں کے خواب دیکھے ،

اُسی کے سوچے محل بنائے، اُسی کے دیکھے سراب، دیکھے

یہ جان کر بھی ....

یہ جان کر بھی ۔

یہ اب جو موڑ آیا ہے

یہ اب جو موڑ آیا ہے
یہاں رُک کر کئی باتیں سمجھنے کی ضرورت ہے
کہ یہ اس راستے کا ایک حصّہ ہی نہیں، سارے
سفر کو جانچنے کا، دیکھنے کا، تولنے کا
ایک پیمانہ بھی ہے، یعنی
یہ ایسا آئنہ ہے
جس میں عکسِ حال و ماضی اور مستقبل
بہ یک لمحہ نمایاں ہے
یہ اُس کا استعارہ ہے
جو اپنی منزلِ جاں ہے

سُنا ہے ریگِ صحرا کے سفر میں
راستے سے دو قدم بھٹکیں
تو منزل تک پہنچنے میں کئی فرسنگ کی دُوری نکلتی ہے
سو اَب جو موڑ آیا ہے
یہاں رُک کر کئی باتیں سمجھنے کی ضرورت ہے

سُورج! تیری آگ بُجھے گی کتنے پانی سے؟

سوچ رہی ہے جانے کب سے آدم کی اولاد

ایک ہی بیج سے جب یہ اتنے ڈھیروں پیڑ اُگے

ایک ہی پیڑ کی شاخ شاخ پہ مہکے جو سب پھُول

ایک ہی پھُول کے دامن میں جو سارے رنگ بھرے

پھر یہ کیسا فرق ہے ان میں، کیسا ہے اُلجھاؤ

ایک ہی پھُول کی ہر پتّی میں دُنیا ایک نئی

ایک ہی شاخ پہ کھِل اُٹھتے ہیں کیسے کیسے پھُول!

ایک ہی پیڑ پہ مِل جاتے ہیں باہم رنگ کئی

لیکن ان کے میل میں بھی ہے اک دُوری موجود
کھا جاتے ہیں زرد و سیہ کو سُرخ اور گہرے رنگ
زور آور سے دب جاتے ہیں، جتنے ہیں کمزور
طاقت والے ہو جاتے ہیں طاقتور کے سنگ

پُوچھ رہی ہے جانے کب سے آدم کی اولاد
سُکھ کا دن کب پیدا ہو گا رات کہانی سے؟
دھرتی! تیرا پیٹ بھرن کو کتنی مٹی ہو!
سُورج! تیری آگ بُجھے گی کتنے پانی سے؟

بیت المقدس کی ایک شام

بہت سال گزرے
اِسی شہرِ اقدس میں اِک شام ایسی بھی روشن ہوئی تھی
کہ جس کے جَلو میں ستاروں کا اِک کارواں بھی رواں تھا
اور اُس کا سفر، آنے والی کئی
چاند آباد صدیوں پہ سایہ کناں تھا

پھر ایسا ہُوا، روشنی کم ہوئی
اور آہستہ آہستہ ظلمت کی چادر نے اس شہرِ اقدس پہ پردہ کیا
اور آنکھوں کے سب طاق ویراں ہوئے

جن چراغوں کی لَو سے ہَوا بدگماں تھی
خود اپنے لیے مرگ ساماں ہُوئے
اور بُجھتے ہوئے آنسوؤں کی نمی نذرِ جاں کر گئے
اور چاروں طرف اِک دُھواں کر گئے

وہ دیوارِ گریہ
جو ظلمت فروشوں کا نقشِ فغاں تھی
ہمارے اَلم کا نشاں بن گئی
بے بسی اور ہزیمت ہمارے سفر کی زباں بن گئی
وہ حزیران کا موسمِ بے نمو، عزم کی کھیتیاں ساتھ لیتا گیا
اَب سیلِ بَلا کتنی ہی بستیاں ساتھ لیتا گیا

میں اُس شہرِ اقدس کے باہر کھڑا ہوں
کہ جس کی فصیلوں میں میرے لہو کے دِیے جل رہے ہیں
ہوا تیز چلنے لگی ہے

سپاہی نے دروازے پر قفل ڈالا ہے
بندوق لہرا کے مجھ سے کہا ہے
" چلو، شام ہونے لگی ہے، چلو، اپنی بستی میں جاؤ
کہ یہ شہرِ اقدس تمھارے لیے شہرِ ممنوع ہے"

اور میں سوچتا ہُوں
درِ شہرِ اقدس کے باہر کھڑا میں یہی سوچتا ہوں
کہاں تک یہ ذلّت کی اور غم کی آتش
مِرے دِل ہی دِل میں سُلگتی رہے گی!
گھنی شام کی یہ گھنیری اُداسی
کہاں تک مرے ساتھ چلتی رہے گی!

چاند مری کھڑکی میں آئے

چاند کبھی تو تاروں کی اِس بھیڑ سے نکلے
اور مری کھڑکی میں آئے
بالکل تنہا اور اکیلا
میں اُس کو باہوں میں بھرلوں
ایک ہی سانس میں سب کی سب وہ باتیں کرلوں
جو میرے، تالو سے چمٹی
دل میں، سمٹی رہتی ہیں
سب کچھ ایسے ہی ہو جائے، جب ہے نا۔
چاند مری کھڑکی میں آئے، تب ہے نا!

سادہ سے اِک چہرے پر

سادہ سے اِک چہرے پر کیا جادُوگر سی آنکھیں ہیں !
جو دیکھے اِن کا ہو جائے
جو اُترے وہ تھاہ نہ پائے
کتنے سپنے جاگ رہے ہیں
اِن پلکوں کے سائے سائے
شمعِ سحر سی، چارہ گر سی، نامہ بر سی آنکھیں ہیں !
اَنجانی، پہچانی بھی
اپنی اور بیگانی بھی

ایک ہی منظر کا حصّہ ہیں!
عکس بھی اور حیرانی بھی

ساحل جیسی لگتی ہیں وہ اور بھنور سی آنکھیں ہیں
سادہ سے اِک چہرے پر کیا جادوگر سی آنکھیں ہیں

ہم کو ہے تیری نظر میں رہنا

خواب بھی ایک مسافر کی طرح ہوتے ہیں
چشم در چشم سدا اِن کو سفر میں رہنا
رنگ کی موج میں، خوشبو کے اثر میں رہنا
ان کی عادت ہی نہیں
ایک جگہ پر رُکنا
ان کی قسمت ہی نہیں
ایک نگر میں رہنا

ہم بھی اِک خواب ہیں اے جان، تری آنکھوں میں
چند لمحوں کو جو ٹھہریں تو ہمیں
اپنی پلکوں کی اماں میں رکھنا
سایۂ ابرِ توجّہ کے گماں میں رکھنا

دھیان کے طاق سے ہم کو نہ ہٹانا، جب تک
رات کے بام پہ تاروں کے دِیے جلتے رہیں
دیکھنا ہم کو، ہمیں دیکھتے جانا، جب تک
ہم تری آنکھ کی وادی میں سفر کرتے رہیں
خواب کا شوق یہی، خواب کی قسمت بھی یہی
حلقۂ ریگِ رواں، گردِ سفر میں رہنا
رنگ کی موج میں، خوشبو کے اثر میں رہنا
ہم مگر خواب ہیں کچھ اور طرح کے، ہم کو
نہ کوئی شوقِ سفر ہے نہ تلاشِ خوشبو
تیری آنکھوں میں جلیں اور انھی میں بُجھ جائیں
چشم در چشم نہیں ہم کو سفر میں رہنا!
ہم کو ہے تیری نظر میں رہنا۔

کاش کبھی تو ایسے ہو!

آنکھیں دیکھیں خواب،
آنکھیں دیکھیں اور کسی کے خواب،
اپنی آنکھیں ہی جب دیکھیں اور کسی کے خواب،
کون بُنے پھر خواب ہمارے، شکوے کون سُنے!
کانٹے کون چُنے!
دل کو ہے بس ایک ہی اُلجھن،
”من چاہی تعبیر سے روشن سپنا، کیسے ہو؟
آنکھوں میں جو خواب بسا ہے، اپنا، کیسے ہو!“

تم دیکھو اِک خواب ،

اپنی آنکھوں سے تم دیکھو میرا خواب ،

اپنی آنکھوں سے تم دیکھو کاش کبھی اک میرا خواب ،

شکووں کی پرچھائیاں اوڑھے، مجھ سے کرو پھر بات ،

مجھ سے کرو یہ بات

دل کو ہے بس ایک ہی اُلجھن ،

من چاہی تعبیر سے روشن، سپنا کیسے ہو !

آنکھوں میں جو خواب ترا ہے "اپنا" کیسے ہو!

تجھے یاد ہے اِسی ریت پر

میں ہوں جس مکان کی چھت تلے

مرا گھر نہیں

ترا نام درج ہے جس جگہ

ترا دَر نہیں

تجھے یاد ہے!

تجھے یاد ہے کسی شام ہم نے بنایا تھا

کہیں ایک چھوٹا سا ریت گھر

اُسی ریت سے، اُسی ریت پر

اُسی ریت پر

جو تھی راہ میں کسی موج کے
کبھی اپنے ہونے کے دھیان میں
کبھی معجزوں کے گمان میں)
ہمیں علم تھا،
ہمیں علم تھا کہ وہ ریت گھر
جو تھے منتظر کسی موج کے
انھیں ٹوٹ جانے سے روکنے کا خیال امرِ محال ہے
اِسی موج و ریگ کے کھیل سے ہی بحال ہے
وہ تلازمہ،
وہی رابطہ، جسے ماننے کے فشار میں
رہِ آگہی کے سراب بھی
سبھی خواب بھی
اِسی ایک لمحۂ مختصر کے حصار میں ہے گھِرا ہُوا
خطِ ریگ بھی، کفِ آب بھی!

پہ یہ داستاں،
تو بھی ترجماں، کسی کھیل کی
اُسی کھیل کی
جسے کھیلتے ہمیں آ لیا کسی رات نے
اُسی رات نے
جسے اپنے خوں سے جواں کیا
مرے شوق نے، ترے ساتھ نے
کسی ان چھوئے سے خیال نے
کسی دُور ہوتی سی بات نے
تجھے یاد ہے، مجھے یاد ہے،
وہ جو بات کی بڑی دیر تک
مرے ہاتھ سے، ترے ہاتھ نے!

کہاں تھا گماں، کسے تھی خبر!

جو کہا تھا شوق کی لہر نے
جو لکھا تھا ریت کی لَوح پر
اُسی ایک شام کا کھیل تھا
اُسی ایک پَل کا جمال تھا
اُسی کھیل میں
اُسی شام کو

وہ جو ریت گھر سے بِکھر گئے
وہ جو ایک پَل میں اُجڑ گئے
مرے خواب تھے !
ترے خواب تھے !

اُسی ایک نقش کے عکس ہیں

اُسی ایک نقش کے عکس ہیں
یہ زمین بھی یہ زمان بھی
جواں آرزو کے صنم کدے
تھکی جستجو کے جہان بھی!
وہی ایک موجِ نمود ہے کبھی دشت میں کبھی باغ میں
اُسی ایک ڈال کے پھول ہیں
یہ یقین بھی یہ گمان بھی!

بہت اچھّا بھی لگتا ہے

بہت اچھا بھی لگتا ہے
اچانک اس طرح دل کا دوبارہ مبتلا ہونا ،
محبّت آشنا ہونا ،

مگر جب دیکھتا ہوں
وقت کتنا جا چکا ہے
راستوں کی دُھول
قدموں اور سروں پر کس طرح سے جم چکی ہے
اور ہم تم
اپنی اپنی زندگی کے دائروں میں
اپنی اپنی گردشوں میں
اس طرح اُلجھے ہوئے ہیں

جس طرح دشتِ فلک میں ساتھ چلتے ،

دو ستارے

جو بظاہر پاس لگتے ہیں

مگر اُن کی رفاقت میں

کروڑوں میل کی تنہائی کا دریا بھی ہوتا ہے ،

"یہ دریا پار کیسے ہو

نہ تم ہو اُس کنارے پر

نہ ہم ہیں اس کنارے پر"

سو بہتر ہے

ہم اپنے اپنے دائروں کے اِس خلا میں گھومتے جائیں

ستاروں کی طرح

اِک ساتھ چمکیں اور دمکیں تو سہی لیکن

یہ اپنے بیچ میں جو فاصلوں کا سُرخ دریا ہے

اسے تسلیم ہی کر لیں !

کہ اس بے پُل کے دریا میں

نہ تم ہی تیَر سکتے ہو، نہ ہم ہی تیَر سکتے ہیں !

بہت اچھا تو لگتا ہے !

اچانک اِس طرح دل کا محبّت آشنا ہونا

دوبارہ مبتلا ہونا ۔

بازی

کیا عجیب قصّہ ہے!
اِس زمیں کے نقشے پر
جو غریب قومیں ہیں
اُن کے پاس جو کچھ ہے
جتنے زور والے ہیں، سب اُنھی کا حصّہ ہے
کیا عجیب قصّہ ہے!

کیا عجیب قصّہ ہے،
زیر دست قوموں کی
سرحدیں بدل جائیں
دستِ اہلِ حشمت کی جنبشِ قلم سے وہ

اٹلسوں کے صفحوں سے

ایک دم نکل جائیں

آستین قاتل کی پھر بھی صاف رہتی ہے

خون اُس کے ہاتھوں پر سر بسر چمکتا ہو

زخم کھانے والوں کی

مضمحل زباں اُس کو

پھر بھی امنِ عالم کا چیمپئن ہی کہتی ہے

کیا عجیب قصّہ ہے!

ظلم کی وکالت میں ان فریب کاروں کی

مختلف زبانیں کیا

ایک ساتھ چلتی ہیں

ریشمی سے لفظوں میں

وحشتیں اگلتی ہیں

آرزوئیں دُنیا کے، زیر دست لوگوں کی

آنسوؤں میں پلتی ہیں

سسکیوں میں ڈھلتی ہیں

(۲)

اِس قمار خانے میں اس گھڑی جو بازی ہے

(دل بہت ہی راضی ہے)

جتنے اچھے پتّے ہیں

سب ہیں ان کے ہاتھوں میں !

آستیں میں سُورج ہیں

چاند ان کے ماتھوں میں !

(۳)

تاش کھیلنے والے !

یہ تو جانتے ہوں گے !

ہاتھ کتنا اچھا ہو ، جیت کتنی بھاری ہو

تاش کے یہ پتّے تو بار بار بٹنے ہیں

کھیل آگے چلنا ہے

ایک دن یہی چالیں

دُوسروں نے چلنی ہیں !!

(۴۷)

وقت کے عناں گیرو، اٹلسوں کے رکھوالو!

کھیل جیتنے والو!

ہار کی گھڑی کو بھی زندگی کی بازی کا

ایک رنگ جانو گے!

پستیوں میں گِر کر بھی

کیا یہ بات مانو گے!

مدّوجزرِ دنیا کا یہ ہی اصل قصّہ ہے!

جس کے ہاتھ جو آئے، وہ اُسی کا حصّہ ہے!

کیا یہ بات مانو گے!

کیا یہ بات مانو گے!!

رات کیوں ہو گئی ؟

میرے شہروں کو کس کی نظر لگ گئی
میری گلیوں کی رونق کہاں کھو گئی
روشنی بجھ گئی ، آگہی سو گئی
ہم تو نکلے تھے ہاتھوں میں سُورج لیے
رات کیوں ہو گئی؟

رات کیوں ہو گئی، طالبانِ سحر!
ہم سے کیوں روشنی نے یہ پردا کیا
کیوں اندھیروں نے رستوں پہ سایا کیا
آؤ سوچیں ذرا
ہم بھی سوچیں ذرا، تم بھی سوچو ذرا!

آگہی سے پرے، روشنی کے بِنا

جتنے امکان ہیں سارے مر جائیں گے

جو بھی تخلیق ہے وہ بِکھر جائے گی

زندگی اپنے چہرے سے ڈر جائے گی

طالبانِ سحر، آؤ سوچیں ذرا، آؤ دیکھیں ذرا،

آرزو کے ستاروں سے دمکا ہوا

پرچمِ روشنی کس طرح پھٹ گیا!

کون سا موڑ ہم سے غلط کٹ گیا!

پھول رُت میں خزاں کس طرح چھا گئی!

بیج کیا بو گئی!

ہم تو نکلے تھے ہاتھوں میں سُورج لیے

رات کیوں ہو گئی!!

وہ ملال تو کوئی اور تھا

مِرے چار سُو جو کِھلا رہا وہ جمال تو کوئی اور تھا!
مِرے خواب جس میں اُلجھ گئے وہ خیال تو کوئی اور تھا!
یہاں کس حساب کو جوڑتے
مِرے صبح و شام بکِھر گئے!
جو ازل کی صُبح کیا گیا وہ سوال تو کوئی اور تھا!
جسے تیرا جان کے رکھ لیا وہ ملال تو کوئی اور تھا!

ہانگ چو[1]

ہے پہاڑوں کے درمیاں یہ نگر
جیسے محبوب کا حسیں چہرا
اپنے عاشق کے گرم ہاتھوں کے
پُرطلب، مضطرب، حصار میں ہو
ایک بوسے کے انتظار میں ہو!

یوں فضا ہو رہی ہے سر تا سر
رنگ جیسے ہوا میں رل جائے
آنکھ میں ڈولتے ہیں یوں منظر
ڈھیر ریشم کا جس طرح کوئی
اُنگلیوں سے پھسل پھسل جائے

[1] عوامی جمہوریہ چین کا ایک خوبصورت شہر

جھیل میں تیرتے ہوئے یہ کنول

بے حد و بے شمار ایسے ہیں

آسماں پر ہوں جس طرح، انجم

جیسے حلقہ کیے ہوئے، موسم

اِک گُلِ نو بہار کی خاطر

خواہشِ وصل میں نہائے ہوئے

جیسے آغازِ عاشقی کے خواب،

کہکشاں راہ میں بچھائے ہوئے

شاعرِ چین کا کہا سچ ہے

"جھیل یہ ہانگ چُو کے دامن کی

جیسے کوئی حسین عورت ہے"

ایک جنت ہے آسمانوں پر

ہانگ چُو اِس زمیں پہ جنت ہے

بیجنگ

نگاہِ شاعرِ مشرق کی پیش بینی نے
ہمالیہ کے جو چشمے اُبلتے دیکھے تھے
نمُو کے جوش نے دریا بنا دیا ہے انھیں
ہر ایک آنکھ میں ٹھہرے تھے جتنے خوابِ گراں
نگارِ صبح کا چہرا بنا دیا ہے انھیں

ہر ایک شے سے نمایاں ہے لذّتِ تعمیر
ہر ایک نقش ہے اِک شاہکار محنت کا

بس ایک خواب ہی دیکھا تمام آنکھوں نے
ہر ایک بوئے گا خوشیاں، ہر ایک کاٹے گا

ہر ایک رشتۂ اُلفت میں استوار بھی ہیں
یہ لوگ ایک بھی ہیں اور بے شمار بھی ہیں

جہانِ نو کی حسیں صبح کا نکھار ہیں یہ
یہ شہر باغ ہے اور قاصدِ بہار ہیں یہ

عوامی جمہوریہ چین کا صدر مقام ۔ پرانا نام پیکنگ

شنگھائی

ڈیڑھ کروڑ انسان
یک دل اور یک جان
ہاتھ میں ڈالے ہاتھ
آگے بڑھتے جائیں
اک دُوجے کے ساتھ
منزل روشن ہے
مہکی سبز بہار
گُلشن گُلشن ہے

محنت پر ایقان
ڈیڑھ کروڑ انسان

ہر جانب تعمیر
مٹی پتّھر دھات

سب میں ہے تنویر
سایا کرتے رُکھ

مِل کر بانٹے ہیں
سارے دُکھ اور سُکھ

بستی ، دِل ، کھلیان
ڈیڑھ کروڑ انسان

ہر اِک ہے مزدور
سانجھی خوشیوں میں

رہتے ہیں مسرور
ہر غنچہ کِھلتا ہے

اِک جیسا انصاف

سب کو ملتا ہے
محنت سب کی شان
یک دل اور یک جان
ڈیڑھ کروڑ اِنسان

ایک دِن

آخری چند دن دسمبر کے
ہر برس ہی گراں گزرتے ہیں
خواہشوں کے نگار خانے سے
کیسے کیسے گماں گزرتے ہیں!

رفتگاں کے بکھرتے سایوں کی
ایک محفل سی دل میں سجتی ہے
فون کی ڈائری کے صفحوں سے
کتنے نمبر پکارتے ہیں مجھے

جن سے مربوط، بے نوا، گھنٹی

اب فقط میرے دل میں بجتی ہے

کس قدر پیارے پیارے ناموں پر

رینگتی بد نما لکیریں سی

میری آنکھوں میں پھیل جاتی ہیں

دُوریاں، دائرے بناتی ہیں،

دھیان کی سیڑھیوں پہ کیا کیا عکس

مشعلیں درد کی جلاتے ہیں

نام جو کٹ گئے ہیں، اُن کے حرف

ایسے کاغذ پہ پھیل جاتے ہیں

حادثے کے مقام پر جیسے

خُون کے سُوکھتے نشانوں پر

چاک سے لائنیں لگاتے ہیں

پھر دسمبر کے آخری دن ہیں

ہر برس کی طرح سے اب کے بھی
ڈائری ایک سوال کرتی ہے
"کیا خبر اس برس کے آخر تک
میرے ان بے چراغ صفحوں سے
کتنے ہی نام کٹ گئے ہوں گے!
کتنے نمبر بکھر کے رستوں میں
گردِ ماضی سے اَٹ گئے ہوں گے!
خاک کی ڈھیریوں کے دامن میں
کتنے طوفاں سمٹ گئے ہوں گے!
ہر دسمبر میں سوچتا ہوں میں
ایک دن اس طرح بھی ہونا ہے
رنگ کو روشنی میں کھونا ہے
اپنے اپنے گھروں میں رکھی ہوئی
ڈائری، دوست دیکھتے ہوں گے!

اُن کی آنکھوں کے خاکدانوں میں
ایک صحرا سا پھیلتا ہو گا!
اور کچھ بے نشان صفحوں سے
نام میرا بھی کٹ گیا ہو گا!!

ہَوا کیوں تیز چلتی ہے!

ہَوا کیوں تیز چلتی ہے!
کوئی بے نام سی دہشت، چمن کے دِل میں پلتی ہے
ہَوا جب تیز چلتی ہے،
ہَوا، کیوں تیز چلتی ہے!

ابھی کلیوں کے چہرے پر بہت سی اوس پڑنی تھی
ابھی پھُولوں نے موسم سے کچھ اپنی بات کرنی تھی
ابھی سے کیوں یہ شمعِ زندگی، بُجھ بُجھ کے جلتی ہے
ہَوا کیوں تیز چلتی ہے!

لپٹ جائے کبھی یہ بادباں سے ،موج سے اُلجھے ۔
کسی صُورت نہ اُلجھن سیلِ بے زنجیر کی سُلجھے
سفینے لَوٹ کر آئے نہیں اور شام ڈھلتی ہے
نواحِ ساحلِ غم میں ہَوا پھر تیز چلتی ہے
ہَوا کیوں تیز چلتی ہے!

خواب

صاحبو، خواب پرندوں کی طرح ہوتے ہیں
چھُونا چاہو تو یہ اُڑ جاتے ہیں
اور پھر ہاتھ نہیں آتے ہیں

کبھی اِک شاخِ تمنّا پہ مہکتے ہوئے گاتے رہنا
داستاں، دُور کے دیسوں کی سُناتے رہنا
ہر نئی رُت میں نیا گیت بنا کر لانا
کبھی ہنسنا، کبھی تا دیر رُلاتے رہنا

اُڑتی خوشبو کی طرح قید نہیں ہو سکتے
کسی بھی تیر سے یہ صَید نہیں ہو سکتے

کبھی منزل کبھی رستوں کی طرح ہوتے ہیں

صاحبو، خواب پرندوں کی طرح ہوتے ہیں

صاحبو، خواب کھلونوں کی طرح ہوتے ہیں

آبگینوں کی طرح پھُوٹ گئے

اِک ذرا ٹھیس لگی، ٹوٹ گئے!

یہ کسی عمُر، کِسی وقت کے پابند نہیں

کبھی گڑیا کی طرح سوئیں گلے سے لگ کر

کبھی کونوں میں پڑے رہتے ہیں بیگانے سے

کسی مانوس سی آہٹ کا اشارا پا کر

دھیان کے طاق میں سجتے ہیں پری خانے سے

خواہشیں دل میں کِھلاتی ہیں ستارے کیا کیا!

آنکھ میں خواب کا اِک چاند اُتر آنے سے

کبھی اپنے کبھی غیروں کی طرح ہوتے ہیں

صاحبو، خواب کھلونوں کی طرح ہوتے ہیں

صاجبو، خواب مکانوں کی طرح ہوتے ہیں
جو بڑی دیر میں گھر بنتے ہیں
اور اِک پل میں کھنڈر بنتے ہیں

اِن دَر و بام میں جو لوگ تھے زندہ' وہ گئے
پر یہ آواز کے سائے نہیں، مرنے والے!
شب کی پہنائی میں کچھ کھوئے ہوئے قدموں کی
آہٹیں ڈھونڈتے رہتے، نہیں مرنے والے!

کس قدر رنگ بہم ہوں تو بنے گلدستہ
ایک لمحے میں بکھر جائیں کسی بات سے وہ!
عُمر بھر جاگ کے کاتیں جو ملائم ریشم
آنکھ جھپکیں تو پھسل جائے وہیں ہاتھ سے وہ

گمشدہ آگ کے شعلوں کی طرح ہوتے ہیں
صاجبو، خواب مکانوں کی طرح ہوتے ہیں

اختر حسین جعفری کے لیے ایک نظم

آج وہ خود بھی بُجھ گیا یارو
جس نے اک روشنی کی رُخصت پر
یہ ابد تاب لفظ لکھّے تھے
"تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں
تُو جُدا ایسے موسموں میں ہُوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں"

آئنے جس کو ڈھونڈتے تھے، خود
ایسا بے مثل عکس گر تھا وہ
سارے کانٹے سمیٹ لیتا تھا
ایسا انمول ہم سفر تھا وہ

وہ جو زرتاب لفظ لکھتا تھا
اُنگلیاں اُس کی رِزق خاک ہوئیں
کتنے سپنے ہوئے ہیں، بے چہرا!
اُس کی آنکھیں جو بُجھ کے راکھ ہوئیں

اپنے دل میں سنبھال کر اس کو
آج ہاتھوں سے کھو رہے ہیں اُسے
ہچکیاں بندھ گئی ہیں لفظوں کی
آئنہ خانے رو رہے ہیں اُسے

اُس کو کس روشنی میں دفنائیں!
اُس کو کس خواب کا بدن ہم دیں!
وہ جو خُوشبو میں ڈھل گیا یارو
اُس کو کس پھُول کا کفن ہم دیں!

مکاں اور مکیں

اِتنی بڑی ان دُنیاؤں میں
اپنے نام کی تختی والی، ایک عمارت
کتنے دُکھوں کی اینٹیں چُن کر گھر بنتی ہے

پتھر پتھر جوڑ کے دیکھو
میں نے بھی اِک گھر ہے بنایا
رنگوں، پھُولوں، تصویروں سے اس کو سجایا
دروازے کی لَوح پہ اپنا نام لکھایا

لیکن اس کے ہر کمرے میں تم رہتے ہو!

اِرادہ

دریا میں قطرے کی صُورت
گمُ ہو جاؤں
اپنے آپ سے باہر نِکلوں
"تم" ہو جاؤں

خزاں کے آخری دن تھے

خزاں کے آخری دن تھے
بہار آئی نہ تھی لیکن
ہوا کے لمس میں اک بے صدا سی نغمگی
محسوس ہوتی تھی

درختوں کے تحیّر میں
کسی بے آسرا اُمید کی لَو تھرتھراتی تھی
گزرگاہوں میں اُڑتے خُشک پتّے
اجنبی لوگوں کے قدموں سے لپٹتے اور اُلجھتے تھے
تو اِک بھُولی ہُوئی تصویر جیسے کوند جاتی تھی ،

ہر اِک منظر کے چہرے پر
لرزتی بے کلی کی ریشمیں چلمن کشیدہ تھی
نظر رستہ نہ پاتی تھی

کچھ ایسا ہی سماں تھا جب
وہ میرے بخت کے صحرا میں ساون کی طرح اُتری
مِرے سانسوں میں مہکی تھی
نگاہوں کے ستارے، آرزو کے استعارے تھے،
تمنّاؤں کے سیلِ شوق میں بہنے لگی تھی وہ
مِرے سینے پہ سر رکھ کر اچانک مُسکرائی
اور کچھ کہنے لگی تھی وہ ......
نہ جانے کیا تھا وہ جُملہ!
وہ اُس کا اَدھ کہا جُملہ،
جو غنچے کی طرح اُن کانپتے ہونٹوں پہ پُھوٹا تھا!
اُسی لمحے کوئی کوئل بڑے ہی دَرد سے کُوکی تھی

وہ جیسے ، اچانک نیند سے جاگی تھی
اور اُس نے بڑے دُکھ سے فلک کی سمت دیکھا تھا
وہ بولی تھی ۔۔۔۔
"ستارہ شام کا روشن ہُوا ہے ، اَب میں چلتی ہوں !"

خزاں کے آخری دن ہیں
ہَوا کے لَمس میں اِک بے صدا سی نغمگی محسوس ہوتی ہے
کوئی مانوس سی خوشبو مِرے کانوں میں کہتی ہے ،
"پھر اُس کے حُسن کا محرم ترا دِل ہونے والا ہے
وہ اُس کا اَدھ کہا جُملہ
مکمّل ہونے والا ہے !"

زنجیر

ریت کی لَوح پہ لکھے ہُوئے دریا کی طرح

یہ جو ہر راہ کے ہمراہ چلی آتی ہے

کیسی دیوار ہے یہ ؟

از اَزل تا بہ اَبد

خواب اور خواب کی تعبیر کے مابین جو یہ

بھاگتے وقت کی تلوار سی لہراتی ہے

کیسی تلوار ہے یہ ؟

یہ جو ہر موڑ پہ رُکتے ہُوئے رستے کی طرح

ڈولتے پاؤں کی زنجیر بنی جاتی ہے

کیسی رفتار ہے یہ ؟

لفظ کی راہ میں، معنی کی گزرگاہوں میں
کون سے سچ کو چھپانے کے لیے
جھوٹ اسٹیج کے پردے کی طرح حائل ہے
یہ بھی معلوم نہیں
کون ناظر ہے یہاں اور تماشا کیا ہے ؟

ریت کی لوح پہ لکھے ہوئے دریا کی طرح
از اُفق تا بہ اُفق
شک کی دیوار چلی جاتی ہے
شک کی دیوار کے اُس پار کا منظر کیا ہے ؟
کون بتلائے مجھے !
بات کا رُوپ ہے کیا، بات کے اندر کیا ہے ؟

رحمان بابا کے لیے ایک نظم

وہ نیم شب کی گھنی اُداسی میں اپنے سائے کے رُوبرو تھا
اور ایک حیرت کا شامیانہ سا چار سُو تھا

یہی وہ حیرت ،
یہی وہ ہستی شکارِ حیرت
تھی جس کی رشکوں سے
اُس کے لفظوں کے بخت جاگے ،
پہاڑ جھمکے ، گلاب چمکے ، درخت جاگے !

وہ وادیوں کی گھنی اُداسی میں

چُپ کی آواز سُننے والا

وہ اَن لکھے لفظ پڑھنے والا

وہ اَن بہے اشک چُننے والا

وہ میری اَرضِ وطن کا شاعر

جو اپنے لفظوں میں جی رہا ہے

وہ اُس کے گیتوں کا ننھا مُسافر

ہر اِک سَفر کا جو مُنتہا ہے

میں جس تحیّر کی راہ میں ہوں

وہ اُس کی منزل سے آشنا ہے

ذرا سی بات

زندگی کے میلے میں، خواہشوں کے ریلے میں
تم سے کیا کہیں جاناں، اِس قدر جھمیلے ہیں!
وقت کی روانی ہے، بخت کی گرانی ہے
سخت بے زمینی ہے، سخت لامکانی ہے
ہجر کے سمندر میں
تخت اور تختے کی ایک ہی کہانی ہے
تم کو جو سنانی ہے
بات گو ذرا سی ہے
بات عُمر بھر کی ہے
(عُمر بھر کی باتیں کب دو گھڑی میں ہوتی ہیں!
درد کے سمندر میں
اَن گنت جزیرے ہیں، بے شمار موتی ہیں)

آنکھ کے درِیچے میں تم نے جو سجایا تھا

بات اُس دیئے کی ہے

بات اُس رَگلے کی ہے

جو لہو کی خلوت میں چور بن کے آتا ہے

لفظ کی فصیلوں پر ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے

زندگی سے لمبی ہے، بات رَت جگے کی ہے

راستے میں کیسے ہو!

بات تخلیئے کی ہے

تخلیئے کی باتوں میں گُفتگُو اضافی ہے

پیار کرنے والوں کو اِک نگاہ کافی ہے

ہو سکے تو سُن جاؤ ایک دن اکیلے میں

تُم سے کیا کہیں جاناں، اِس قدر جھمیلے میں

محبّت

مجبّت اوس کی صُورت
پیاسی پنکھڑی کے ہونٹ کو سیراب کرتی ہے
گلُوں کی آستینوں میں انوکھے رنگ بھرتی ہے
سحر کے جُھٹپٹے میں، گنگناتی، مُسکراتی، جگمگاتی ہے
مجبّت کے دنوں میں دشت بھی محسوس ہوتا ہے
کسی فردوس کی صُورت
مجبّت اوس کی صُورت

محبّت اَبر کی صُورت

دلوں کی سرزمیں پہ گھِر کے آتی اور برستی ہے

چمن کا ذرّہ ذرّہ جھُومتا ہے، مُسکراتا ہے

اَزل کی بے نمو مٹّی میں سبزہ سَر اُٹھاتا ہے

محبّت اُن کو بھی آباد اور شاداب کرتی ہے

جو دل ہیں قبر کی صُورت

محبّت اَبر کی صُورت!

محبّت آگ کی صُورت،

بُجھے سینوں میں جلتی ہے تو دل بیدار ہوتے ہیں

محبّت کی تپش میں کچُھ عجب اَسرار ہوتے ہیں

کہ جتنا یہ بھڑکتی ہے، عروسِ جاں مہکتی ہے

دلوں کے ساحلوں پر جمع ہوتی اور بکھرتی ہے

محبّت، جھاگ کی صُورت

محبّت، آگ کی صُورت!

محبّت خواب کی صُورت ،

نگاہوں میں اُترتی ہے کسی مہتاب کی صُورت
ستارے آرزو کے اس طرح سے جگمگاتے ہیں
کہ پہچانی نہیں جاتی دلِ بے تاب کی صُورت!
محبّت کے شجر پر خواب کے پنچھی اُترتے ہیں
تو شاخیں جاگ اُٹھتی ہیں
تھکے ہارے ستارے جب زمیں سے بات کرتے ہیں
تو کب کی منتظر آنکھوں میں
شمعیں جاگ اُٹھتی ہیں
محبّت اِن میں جلتی ہے چراغِ آب کی صُورت
محبّت، خواب کی صُورت!

محبّت درد کی صُورت

گزشتہ موسموں کا استعارہ بن کے رہتی ہے
شبانِ ہجر میں، روشن ستارہ بن کے رہتی ہے

منڈیروں پر چراغوں کی لَویں جب تھرتھراتی ہیں
نگر میں نااُمیدی کی ہَوائیں سنسناتی ہیں
گلی میں جب کوئی آہٹ، کوئی سایہ نہیں رہتا
دُکھے دل کے لیے جب کوئی بھی دھوکہ نہیں رہتا
غموں کے بوجھ سے جب ٹوٹنے لگتے ہیں شانے تو
یہ اُن پہ ہاتھ رکھتی ہے
کِسی ہمدرد کی صُورت!
گزُر جاتے ہیں سارے قافلے جب دِل کی بستی سے
فضا میں تیرتی ہے دیر تک
یہ گَرد کی صُورت،
محبّت، دَرد کی صُورت!

مجھے اپنا ستارا ڈھونڈنا ہے

ستارا ڈھونڈنا ہے
ستاروں سے بھرے اِس آسماں کی وسعتوں میں
مجھے اپنا ستارا ڈھونڈنا ہے

فلک پر کہکشاں در کہکشاں اِک بے کرانی ہے
نہ اُس کا نام ہے معلوم ، ناں کوئی نشانی ہے

بس اِتنا یاد ہے مجھ کو
اَزل کی صبح جب سارے ستارے
الوداعی گفتگو کرتے ہوئے رستوں پہ نکلے تھے

تو اُس کی آنکھ میں اِک اور تارا جِھلملایا تھا
اُسی تارے کی صُورت کا
مری بھیگی ہُوئی آنکھوں میں بھی اِک خواب رہتا ہے
میں اپنے آنسوؤں میں اپنے خوابوں کو سجاتا ہوں
اور اُس کی راہ تکتا ہُوں
سُنا ہے گُمشدہ چیزیں
جہاں پر کھوئی جاتی ہیں
وہیں سے مل بھی جاتی ہیں

مجُھے اپنا ستارا ڈھونڈنا ہے !

اے دُنیا

اے دُنیا ، ہم کب تک تیرے ساتھ چلیں !
جو موزوں پیمانہ دیکھیں اُس میں ڈھلتے جائیں
چہرہ بدلیں ، لہجہ بدلیں ، آنکھ بدلتے جائیں
کب تک ہم اِس جھُوٹ نگر میں یُونہی چلتے جائیں

اندر کی اِس آگ میں کِتنا اور جلیں !
اے دُنیا ہم کب تک تیرے ساتھ چلیں !
اپنے شک کی دیواروں کے نیچے بیٹھے ہیں
دیکھ رہے ہیں ، پھر بھی ، آنکھیں میچے بیٹھے ہیں
دوست ہمارے ہر جھاڑی کے پیچھے بیٹھے ہیں

اِک دُوجے کے خُون پہ کِتنا اور پلیں !

اے دُنیا ہم کب تک تیرے ساتھ چلیں !

اے دُنیا تُو چار طرف ہے تیرے رُوپ ہزار

جو بھی بھاگے، جتنا بھاگے ! تجھ سے نہیں فرار

آپ مریں یا تجھ کو ماریں، دونوں ہیں دُشوار

کب تک ہم پچھتائیں، کب تک ہاتھ مَلیں !

اے دُنیا ہم کب تک تیرے ساتھ چلیں!

ابھی کچھ دِنوں میں

ابھی کچھ دِنوں میں
مِری عمر کی اِک دہائی ، یہ چوتھی دہائی
گزشتہ دہائیوں کی مانند فردا سے
اُبھرے گی اور راکھ ہو جائے گی
وقت کے دشتِ حیرت میں کھو جائے گی!

شب و روز کے اِس تسلسل میں چالیس برسوں
یہ پھَیلے ہوئے خواب مجھ سے پتہ پوچھتے ہیں

خُود اپنے ہی چھوڑے ہُوئے راستوں کا !

سُلگتے ہُوئے بے صدا رت جگوں کا

بھٹکتی ہُوئی بے ثمر بارشوں کا!

لہو میں مچلتی ہُوئی خواہشوں کا

وہ لمحے، جو غم کی کمانوں سے چھُوٹے تو سیدھے دِلوں میں ترازو ہُوئے!

وہ لمحے، جو زُلفوں کی چھاؤں میں گزرے تو ہر آس کے دست و بازو ہُوئے!

وہ لمحے، جنھیں بھُول جانے کی خاطر میں اَن دیکھے رستوں پہ چلتا رہا

وہ لمحے، جنھیں دیکھنے کے لیے میں چراغوں کی مانند جلتا رہا

جمع و تفریق کے اِس مسلسل عمل میں

جو لمحہ بھی گزرے پلٹتا نہیں

وقت کے آئنے میں کوئی عکس بھی

ایک پَل سے زیادہ ٹھہرتا نہیں

(۲)

وقت شطرنج ہے !

جس کی چالوں کو گِننا، ستاروں کے گِننے سے کمتر نہیں

اور ہمارا سَفر ــــــ یہ اَزل سے اَبد تک کا سارا سفر!

انہی چند خانوں کی گردش میں ہے، اِن سے باہر نہیں!

(۳)

عُمر کی جس دُہائی کی سرحد پہ میں ہوں

وہاں پر زمانے!

کمانوں سے چھوٹے، بھٹکتے ہُوئے تیر جیسے زمانے!

بس اِک پَل کو رُکتے ہیں

آپس میں ملتے ہیں

اِک دُوسرے کی طرف دیکھتے ہیں...،

مگر اس سے پہلے کہ کچھ بول پائیں

اُون کے اِس اُلجھتے ہُوئے ڈھیر کا اِک سِرا کھول پائیں

مُلاقات کی مہلتِ یک نفَس ختم ہوتی ہے

اور زندگی

جیل کے وارڈن کی طرح ان زمانوں کو پھر

بیرکوں کے اندھیرے میں لے جاتی ہے
وقت کی بیرکیں
جن میں ماضی بھی ہے اور آئندہ بھی ـــ حال کوئی نہیں
ایک پُل کی طرح
عُمر کے اس سمندر پہ ٹھہرا ہُوا کوئی لمحہ نہیں ـــ سال کوئی نہیں
ابھی کچھُ دنوں میں مری عُمر کی یہ دُہائی بھی گزُری دہائیوں کی مانند
فردا سے اُبھرے گی اور راکھ ہو جائے گی
وقت کے دشتِ حیرت میں کھو جائے گی!
ابھی کچھُ دنوں میں . . . ،
ابھی کچھُ دنوں میں ؎

اِس بھید بھری چُپ میں

اے شمعِ کوُئے جاناں ،
ہے تیز ہَوا ، مانا
تُو اپنی بچا رکھنا ــــ رستوں پہ نگہ رکھنا

ایسی ہی کسی شب میں
آئے گا یہاں کوئی ، کچھ زخم دکھانے کو
اِک ٹوٹا ہُوا وعدہ ، مٹّی سے اُٹھانے کو

پیروں پہ لہو اُس کے
آنکھوں میں دُھواں ہو گا

چہرے کی دراڑوں میں
بیتے ہُوئے برسوں کا

ایک ایک نشاں ہوگا
بولے گا نہ کچھ لیکن، فریاد کُناں ہوگا

اے شمع کوئے جاناں
وہ خاک بسر راہی ــــ وہ سوختہ پروانہ
جب آئے یہاں اُس کو مایوس نہ لوٹانا!
ہو تیز ہَوا کتنی، تُو اپنی بچا رکھنا
رستوں پہ نگہ رکھنا ــــ راہی کا پتا رکھنا،

اِس بھید بھری چُپ میں اِک پُھول نے کِھلنا ہے!
اُس نے انہی گلیوں میں، اِک شخص سے مِلنا ہے!!

عُمر کی سیڑھیاں

ہاں، سنو دوستو!
جو بھی دُنیا کہے
اُس کو پرکھے بِنا، مان لینا نہیں۔
ساری دُنیا یہ کہتی ہے،
پربت پہ چڑھنے کی نسبت اُترنا بہت سہل ہے
کس طرح مان لیں،
تُم نے دیکھا نہیں!
سرفرازی کی دُھن میں کوئی آدمی

جب بلندی کے رستے پہ چلتا ہے تو
سانس تک ٹھیک کرنے کو رُکتا نہیں
اور اُسی شخص کا
عُمر کی سیڑھیوں سے اُترتے ہُوئے
پاؤں اُٹھتا نہیں!
اِس لیے دوستو، جو بھی دُنیا کہے
اُس کو پرکھے بِنا، مان لینا نہیں۔
ساری دُنیا یہ کہتی ہے
اصلِ سفر تو مُسافر کی آنکھوں میں پھیلا ہُوا خواب ہے
کِس طرح مان لیں،
تم نے دیکھا نہیں
عمر کے اس سرابِ اَجل خیز میں
خواب تو خواب ہیں
ہم کُھلی آنکھ سے جو بھی کچھ دیکھتے ہیں
وہ ہوتا نہیں
راستے کے لیے (راستے کی طرح)
آدمی اپنے خوابوں کو بھی کاٹ دیتے ہیں لیکن

سُلگتا ہوا راستہ

پھر بھی کٹتا نہیں !

اس لیے دوستو

جو بھی دُنیا کہے

اُس کو پرکھے بِنا ، مان لینا نہیں ۔

آج

یہ "آج" جو کل میں زندہ تھا

وہ "کل" جو آج میں زندہ ہے

وہ "کل" جو "کل" کے ساتھ گیا

وہ "کل" جو ابھی آئندہ ہے

گزر چکے اور آنے والے، جتنے "کل" ہیں، جتنے "کل" تھے!

ان کا کوئی وجود نہ ہوتا

ہم اور تم بے اسم ہی رہتے

"آج" اگر موجود نہ ہوتا

ممکن ہے "آیندہ" صرف اِک خواب ہو جس کی
تعبیروں میں جینے والی ساری آنکھیں ڈوب چکی ہوں !
(لیکن وہ خُود بجھ کر بھی رخشندہ ہو!)

ہو سکتا ہے
"رفتہ" کی دہلیز پہ ٹھہری
بھید بھری اس آنکھ کے اندر
چُھپا ہُوا آئندہ ہو !
"آئندہ" کے مُنہ پہ پڑی یہ غیب کی چادر
اُٹھ جائے تو ہو سکتا ہے
اس میں ہمارا اور تمھارا
ایک اِک لمحہ زندہ ہو
(روشن اور تابندہ ہو!)
لیکن یہ بھی دھیان میں رکھنا
ہو سکتا ہے آنے والے کل میں ہمارا "آج" نہ ہو
اور اُس کی جگہ

اِک ایسے وقت کا سایہ سار قصندہ ہو، جو
ماضی، حال اور مستقبل کے
تین کناروں والے اس دریا سے یکسر باہر ہو
(اور کہیں سے جنم ہوا اس کا ــــ اور کہیں پہ ظاہر ہو!)

ماضی، حال اور مستقبل !
تین کناروں والے اِس دریا کے اندر
اپنی اپنی موجیں مارتے چلتے ہیں
پھر اُس لہر میں ڈھلتے ہیں
جو صُبحِ اَزل کو اُچھلی تھی اور اب تک کہیں مُعلّق ہے!
اُسی معلّق لہر کے بے خُود قطرے ہیں ہم،
ہم اور ہم سے اربوں، کھربوں
(گُزر چکے اور آنے والے)
سو، اے وقت کی حیرت میں کھو جانے والی آنکھ ــــ ٹھہر!
"آج" کے پُل پر رُک کر آگے پیچھے دیکھ

روشنی اور تاریکی شاید، ایک ہی ڈال کے پتّے ہیں !

لمحوں کا یہ فرق نظر کا دھوکہ ہے ،

وقت کی اِس "ناوقتی" کے سیلاب میں ـــــ شاید !

"آج" ہی واحد لمحہ ہے !!

عمرِ رواں کی دہشت میں کھو جانے والی آنکھ ـــــ ٹھہر !

سپنے کیسے بات کریں

سپنے کیسے بات کریں !

خدشوں کی زنجیر پڑی ہے نیند بھری سب آنکھوں میں

سپنے کیسے بات کریں !

سپنے کِس سے بات کریں !

جن لوگوں کا رستہ تکتے عُمریں رزقِ خاک ہُوئیں

اب وہ لوگ اور اُن کے سپنے دیکھنے والی

آنکھیں بجُھ کر راکھ ہُوئیں

راکھ کے اس انبار میں ہوں گے کیسے کیسے زندہ خواب !

خوابوں کی اس راکھ کو لیکن چھیڑے کون ؟

جس رستے پر چھاؤں نہ پانی

اُس پر ڈالے ڈیرے کون؟

جس مٹی میں ریت مِلی ہو

اُس میں کیسے باغ لگائیں!

دریا ہی پایاب ہو جب تو

اِس میں کشتی کیا لے جائیں!

خُوشبو ایک آوارہ جھونکا، اس جھونکے کو گھیرے کون!

کیسے دُنیا کو بتلاؤں، تم ہوتے ہو میرے کون!!

منظر — پس منظر

کاسہ ہے گدائی کا درویش کا پیالہ بھی
مانگے کی ضیا لے کر یہ چاند ہوا روشن
یہ چاند ہُوا روشن اور چاند کا ہالہ بھی!

امروز کا پردا ہو، ماضی ہو کہ فردا ہو!
اِک بھید انوکھا ہے، اِک راز یہ گہرا ہے!
اس برف کی گھاٹی پہ کچُھ دیر کو ٹھہرا ہے
خوابوں کا اُجالا بھی، دن رات کا جالا بھی
یہ بُجھتا ہوا منظر اور دیکھنے والا بھی!

خواب اور خدشے

جاگتے میں بھی سوتی ہیں!
کچھ آنکھیں ایسی ہوتی ہیں!
بے موسم کلیوں کی صورت ہولے ہولے کھلتی ہیں
دنیا کی اس بھیڑ میں یونہی اک لمحے کو ملتی ہیں،
محفل محفل گھومنے والے
لوگ اکیلے ہو جاتے ہیں
ان آنکھوں کی کھوج میں اکثر
اپنے آپ کو کھو جاتے ہیں

میں نے بھی دیکھی تھیں اِک دِن

ایسی ہی دو مُشکل آنکھیں

ہلکی سبز اور بوجھل آنکھیں

یوں تو اَب تک جِتنی گزُری خُوش چشموں میں گزُری ہے

لیکن ایسے گہرے ساگر!

لیکن ایسی ساحل آنکھیں!

یوں لگتا تھا جیسے میری رُوح میں رستہ بن جائے گا

یا پھر اِک بے نام سا پردا ہر منظر پہ تن جائے گا

ساتویں دروازے کی صُورت، ہستی مجُھ پر کھُل جائے گی

یا پھر شمعِ ہجر کی صُورت قطرہ قطرہ گھُل جائے گی

یوں لگتا تھا جیسے اَب وہ

موڑ بس آنے والا ہے

جس کے بعد اُجالا ہے

(یا پھر باقی عمُر کا رستہ اِک بے معنی ہالہ ہے!)

اُن آنکھوں کی راہ میں سب یہ

خواب اور خدشے رکھوں گا

اب جو اُن کو دیکھوں گا

اور دیکھ سکا

تو پُوچھوں گا ـــــ !!

مَیں اور وہ

میں اُس کو دیکھتا ہُوں
پیاس کا مارا ہُوا جیسے
بہت ہی فاصلے سے اِک کنوئیں کو دیکھتا ہے

میں اُس کو چُومتا ہُوں
تاش میں ہارا ہُوا جیسے
اخیری داؤ کے پتّے اُٹھا کر چُومتا ہے۔

وہ تو بھری بہار کے دن تھے!

موسموں کے اس ملنے اور جُدا ہونے سے
جانے دِل کا کیا رشتہ ہے!
جب اک موسم دُوسرے موسم سے ملتا ہے
جانے کیوں اِس دل کے اندر ــــ دُور کہیں پر
ایک چھناکا سا ہوتا ہے
جیسے کچُھ شیشے کے برتن
اِک وحشی آواز کو سُن کر
نم ہاتھوں سے چھُوٹ گئے ہوں
چھوٹے سے دو ریت گھروندے
بنتے بنتے ٹوٹ گئے ہوں

بُجھتی رات کا سنّاٹا کیوں

خوف رگوں میں بھرتا ہے ؟

پت جھڑ کی دہلیز پہ ٹھہرا

لمحہ کس سے ڈرتا ہے ؟

وہ تو پُورے چاند کی شب تھی جب اِک تارا ٹوٹا تھا!

وہ تو بھری بہار کے دن تھے جب تُو مُجھ سے بچھڑا تھا!

ایک کمرۂ امتحان میں

بے نگاہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں پرچے کو
بے خیال ہاتھوں سے
اَن بنے سے نفظوں پر اُنگلیاں گھُماتے ہیں
یا سوالنامے کو دیکھتے ہی جاتے ہیں !

ہر طرف کنکھیوں سے بچ بچا کے تکتے ہیں
دُوسروں کے پرچوں کو رہنما سمجھتے ہیں ،
شاید اس طرح کوئی ، راستہ ہی مِل جائے !
بے نشاں جوابوں کا کچھُ پتہ ہی مِل جائے !

مجھ کو دیکھتے ہیں تو

یوں جواب کاپی پر ، حاشیے لگاتے ہیں

دائرے بناتے ہیں

جیسے اِن کو پرچے کے سب جواب آتے ہیں

اِس طرح کے منظر میں

امتحان گاہوں میں ، دیکھتا ہی رہتا تھا

نقل کرنے والوں کے

نت نئے طریقوں سے

آپ لُطف لیتا تھا ، دوستوں سے کہتا تھا

کس طرف سے جانے یہ

آج دل کے آنگن میں اِک خیال آیا ہے

سینکڑوں سوالوں سا اِک سوال لایا ہے

"وقت کی عدالت میں

زندگی کی صُورت میں

یہ جو تیرے ہاتھوں میں، اِک سوالنامہ ہے

کِس نے یہ بنایا ہے !

کِس لیے بنایا ہے !

کچھ سمجھ میں آیا ہے ؟

زندگی کے پرچے کے

سب سوال لازم ہیں، سب سوال مشکل ہیں !

بے نگاہ آنکھوں سے دیکھتا ہوں پرچے کو

بے خیال ہاتھوں سے

اَن بنے سے لفظوں پر اُنگلیاں گھُماتا ہوں

حاشیے لگاتا ہوں

دائرے بناتا ہوں

یا سوالنامے کو

دیکھتا ہی جاتا ہوں !

پھر بھی

دن رات کے آنے جانے میں

دُنیا کے عجائب خانے میں

کبھی شیشے دُھندلے ہوتے ہیں، کبھی منظر صاف نہیں ہوتے!

کبھی سُورج بات نہیں کرتا

کبھی تارے آنکھ بدلتے ہیں

کبھی منزل پیچھے رہتی ہے

کبھی رستے آگے چلتے ہیں

کبھی آسیں توڑ نہیں چڑھتیں

کبھی خدشے پورے ہوتے ہیں

کبھی آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں

کبھی خواب ادھورے ہوتے ہیں

یہ سب تو صحیح ہے لیکن اس

آشوب کے منظر نامے میں

(دن رات کے آنے جانے میں

دُنیا کے عجائب خانے میں)

کچھ سایہ کرتی آنکھوں کے پیماں تو دکھائی دیتے ہیں!

ہاتھوں سے اگرچہ دُور سہی، امکاں تو دکھائی دیتے ہیں!

ہاں، ریت کے اِس دریا سے اُدھر

اِک پیڑوں والی بستی کے عنواں تو دکھائی دیتے ہیں!

منزل سے کوسوں دُور سہی

پُر درد سہی ، رنجور سہی

زخموں سے مُسافر چُور سہی

پر کس سے کہیں اے جانِ وفا

کچھ ایسے گھاؤ بھی ہوتے ہیں جنھیں زخمی آپ نہیں دھوتے

بن روئے ہوئے آنسو کی طرح سینے میں چھپا کر رکھتے ہیں

اور ساری عُمر نہیں روتے

نیندیں بھی مہیّا ہوتی ہیں، سپنے بھی دُور نہیں ہوتے
کیوں پھر بھی جاگتے رہتے ہیں! کیوں ساری رات نہیں سوتے!
اَب کِس سے کہیں اے جانِ وفا!
یہ اہلِ وفا
کِس آگ میں جلتے رہتے ہیں! کیوں بجُھ کر راکھ نہیں ہوتے!

ہَوا سیٹی بجاتی ہے

خزاں کی بالکونی سے
ہَوا سیٹی بجاتی ہے
”چلو ــــ چلنے کا وقت آیا“

درختوں سے ہزاروں خشک پتّے ٹوٹتے ہیں
اور اُس کے ساتھ اُڑتے ہیں
وہ شاید خُود نہیں اُڑتے ..... ؟

قضا اُن کو اُڑاتی ہے

ہَوا سیٹی بجاتی ہے

. . . . تو یہ اُڑتے ہُوئے پتّے

گلستاں کے کسی نامہرباں گوشے میں تھوڑی دیر کو رُکتے ہیں

رپیلی گھاس کے اُس اجنبی صحرا کو تکتے ہیں

جو اُن کے ___ اور اُن کے آشیاں کے، درمیاں پھیلا ہُوا ہے

اور جس کی حد نہیں ملتی

خزاں اس اجنبی صحرا کی حدِّ ممکنہ سے

اُن کی جانب، دیکھتی ہے

اور اک فاتح کی صُورت مُسکراتی ہے

ہَوا سیٹی بجاتی ہے

ہَوا سیٹی بجاتی ہے تو یہ رُکتے ہُوئے پتّے

کسی انجان سی دہشت کے ڈر سے کپکپاتے ہیں

لرز کر سر جُھکاتے ہیں

گُلستان کے کسی نامہرباں گوشے کی پَستی سے ہَوا اِن کو اُٹھاتی ہے
ہَوا ان کو اُٹھا کر شہر کی بے مُدّعا سڑکوں پہ لاتی ہے

میں ان پتّوں کو جب شہروں کی سڑکوں پر بکھرتے دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں ــــ !
"ادھورے خواب کی صُورت یہ بے گُل، بے نوا پتّے
جب اُڑتے ہیں تو اپنے دل میں کیا کیا سوچتے ہوں گے !
سفر کے زخم کا کچھ تو مداوا سوچتے ہوں گے !"
میں اپنے پاؤں سے لپٹا ہوا اِک مُضطرب پتّہ اُٹھاتا ہُوں
اور اُس سے پُوچھتا ہوں ــــ !
مری باتیں وہ سُنتا ہے مگر کچھ بھی نہیں کہتا
بس اک زخمی نگہ سے میری جانب دیکھتا ہے
دُکھ بھرا چہرا اُٹھاتا ہے
اچانک وقت رُکتا ہے ــــ
میں اُس پتّے کے چہرے میں خود اپنا عکس پاتا ہوں

کسی انجان سی دہشت کے ڈر سے کپکپاتا ہوں
مری گردن پہ جیسے چھپکلی سی سرسراتی ہے
فضا میں اجنبی سے درد کا کہرا ابھرتا ہے
نمی سی پھیل جاتی ہے۔ ہَوا سیٹی بجاتی ہے
خزاں کی بالکونی سے
ہَوا سیٹی بجاتی ہے.....!

قاصد

خُوشبُو کی پوشاک پہن کر
کون گلی میں آیا ہے !
کیسا یہ پیغام رساں ہے
کیا کیا خبریں لایا ہے!

کھڑکی کھول کے باہر دیکھو،
موسم میرے دل کی باتیں، تم سے کہنے آیا ہے

صدائے آشنا

تری آہٹ

سُلگتی دوپہر کو ایک پَل میں شام کرتی ہے

اُترتی ہے سوادِ ہجر میں کچھ اس طرح جیسے

صدائے آشنا کوئی

گھنے، گھرے، اندھیرے جنگلوں کی بے یقینی میں

رُخِ منزل دکھاتی

روشنی کا کام کرتی ہے!

ابھی تو

ابھی تو رُت بدلنی تھی ابھی تو پھُول کھلنے تھے
ابھی تو رات ڈھلنی تھی ابھی تو زخم سلنے تھے

ابھی تو سرزمینِ جاں پہ اِک بادل کو گھِرنا تھا
ابھی تو وصل کی بارش میں ننگے پاؤں پھرنا تھا

ابھی تو کشتِ غم میں اِک خوشی کا خواب بُونا تھا
ابھی تو سینکڑوں سوچی ہُوئی باتوں کو ہونا تھا

ابھی تو ساحلوں پر اِک ہوائے شاد چلنی تھی
ابھی جو چل رہی ہے، یہ تو کچھُ دن بعد چلنی تھی!

وقت بھی کتنا ظالم ہے

اِتنے برس کی دُوری اور مہجوری کے
افسونِ سَفر میں لپٹا ہُوا
اِک شخص اچانک آن ملا
میں اُس کو دیکھ کے ششدر تھا
وہ مجھ سے سوا حیران ملا!

{ یہ وقت بھی کتنا ظالم ہے!
اِس ہجر میں کیا کیا روئے تھے، ہم
اِس یاد میں کیا کیا کھوئے تھے، ہم! }

کچھ دیر تو دونوں چُپ سے رہے ،

پھر اُس نے کہا ــــ "تم کیسے ہو ؟"

اور میں نے کہا ــــ "بس اچھا ہوں"

پھر اُس نے کہا ،

"یہ اتنے دنوں کے بعد کا مِلنا خوب رہا . . . . !

کوئی پرانا دوست ملے تو دل کو بھلا سا لگتا ہے . . . .

یہ شہر تو بالکل بدل گیا . . . . .اب چلتی ہوں !"

پھر میں نے کہا ،

"میں شام سمے ہر روز یہاں پر آتا ہوں . . . . .

جب وقت ملے تم آ جانا . . .

اس وقت مجھے بھی جلدی ہے . . . . .اب چلتا ہوں !"

یہ وقت بھی کتنا ظالم ہے !!!

دُوسری مُلاقات

ہجر کی پہلی شام سے اب تک
جتنی شامیں گُزری تھیں!
اُن کی پتھر چُپ میں، مَیں نے
(اُس کے سامنے کرنے والی)
کیا کیا باتیں سوچی تھیں!

"باتیں، گُزرے برسوں کی جو ہم نے الگ سے کاٹے ہیں
غموں کی اور اُن خوشیوں کی ہم جن سے ہو کر گُزرے ہیں
جیتوں اور اُن ماتوں کی جو عُمرِ رواں کا رزق ہُوئیں!
آسوں اور اُمنگوں کی جو دشتِ گُماں کا رِزق ہُوئیں"

کیسے کیسے بھٹکے آہو، صحرائے امکان میں آئے
شمعِ طلب کے کیسے کیسے روشن پہلو دھیان میں آئے

"ڈھلتی رات کا جادو ہوگا!
لمحہ لمحہ خوشبو ہوگا!
پھول اور تتلی یکجا ہونگے!
رنگ ہوا سے پیدا ہونگے!

ایک ہی وصل کی بارش سے وہ سارے شکوے دھو دے گا
یعنی میرے ساتھ لپٹ کر، کچھ نہ کہے گا، رو دے گا

ارمانوں کا پھول اچانک کھل ہی گیا
جس کے غم میں آنکھ برستی رہتی تھی
آج مجھے وہ مل ہی گیا
جس کو میری پیاس ترستی رہتی تھی
وہ ایک چھلکتا جام مرے ہمراہ رہا
آج وہ ساری شام مرے ہمراہ رہا

لیکن اب وہ اور تھا کوئی ، اور تھا اُس کا رُوپ نگر
اوس رُکی تھی آنکھوں میں تو راکھ جمی تھی بالوں پر
اور کوئی تھی دُنیا اُس کی ، اور تھے اُس کے شام و سحر
(میری حیرت لکھی ہُوئی تھی شاید میرے چہرے پر!!)

اُس نے کہا ، " تم مجھے نہ دیکھو ، آبِ روانِ وقت سے پُوچھو
جیون کے اس پُل نیچے سے کتنا پانی گزر چکا ہے -!
مجھ میں جو اِک شخص تھا زندہ ، وہ تو کب کا بکھر چکا ہے
میں تو فقط رستہ ہوں اُس کا ، دریا جو تھا اُتر چکا ہے

آؤ چلو اب اپنی اپنی دُنیا کو ہم لَوٹ چلیں
حدِّ ابد تک اس رستے میں بکھرے ہیں غم لَوٹ چلیں!"

پلٹے ہم تو ہم دونوں کے ساتھ زمانہ پلٹ گیا
اَن دیکھی تعبیر لیئے اِک خواب پرانا پلٹ گیا

چاروں جانب بکھر رہی تھی

ایک اُدھوری تنہائی

ہَوا نے رُک کر ہم دونوں کو

مُڑتے دیکھا تو گبھرائی

پت جھڑ کی دہلیز پہ اُس نے

پیڑ سے کچھ سرگوشی کی

اِس کے بعد اُس راہ گزر پر

دُور تلک خاموشی تھی

آسمان پر بادل تھا اور اُس میں تارے سمٹے تھے
ہم دونوں کے قدموں سے کچھ سُوکھے پتّے پلٹے تھے!!

تیرے دھیان کی تیز ہوا

پت جھڑ کی دہلیز پہ بکھرے
بے چہرا پتّوں کی صُورت
ہم کو ساتھ لیے پھرتی ہے
تیرے دھیان کی تیز ہَوا!

جنگلی پھولوں کے لیے۔ ایک نظم

خُوش نما لڑکیو
خُوش ادا لڑکیو
تم جو ہنستی ہُوئی کِھلکھلاتی ہُوئی
خُوشبُوؤں کی طرح رقص کرتی ہُوئی
کہکشاں کی طرح جگمگاتی ہُوئی
راہ چلتی ہو تو
ایسے لگتا ہے جیسے
زمیں پر دھنک سی اُتر آئی ہو

اپنے بے باک سے قہقہوں کے ترنّم میں گُم جس گھڑی

تُم سروں کو جھٹک کر

گھٹاؤں سی زُلفوں کو

چہروں کے جادُو گھروں سے ہٹاتی ہو تو

ایسے لگتا ہے جیسے

اچانک فضا میں بہار آگئی ہو !

دُکھوں کا وہ صحرا

جو چاروں طرف پھیلتا جا رہا تھا

سمٹ سا گیا ہے ،

مُجھے یہ پتہ ہے !

ابھی تم جو اس رہگزر سے

مری سمت دیکھے بنا

اپنی عمُروں کی شبنم میں بھیگی ہُوئی

خوشبوؤں کی طرح سے گزُر جاؤ گی

تو یہ جادُو بھی نابُود ہو جائے گا

مگر لڑکیو،

خُوش نما، خُوش اَدا، بے خبر لڑکیو

میں تمُہارے لیے اپنے دل کی تہوں سے

دُعا مانگتا ہوں

تم یُونہی خوش رہو، مسکراتی رہو

سرخُوشی کا وہ پَل

جو تمہارے وسیلے مرے دل پہ نازل ہُوا ہے

تمُہارے شب و روز پر اس طرح پھیل جائے

کہ تم اس کی خُوشبو سے مہکی رہو

اور دن ڈوب جائے

لوگ محبّت کرنے والے

چُپکے چُپکے جل جاتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!
پُروا سنگ نِکل جاتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!
آنکھوں آنکھوں چل پڑتے ہیں تاروں کی قندیل لیے
چاند کے ساتھ ہی ڈھل جاتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!

دل میں پھول کھلا دیتے ہیں

لوگ محبّت کرنے والے!

آگ میں راگ جگا دیتے ہیں

لوگ محبّت کرنے والے!

پانی بیچ بتاشہ صورت خود تو گھلتے رہتے ہیں

سم کو شہد بنا دیتے ہیں

لوگ محبّت کرنے والے!

خواب خوشی کے بو جاتے ہیں

لوگ محبّت کرنے والے!

زخم دلوں کے دھو جاتے ہیں

لوگ محبّت کرنے والے!

تتلی تتلی لہراتے ہیں پھولوں کی امّید لیے

اک دن خوشبو ہو جاتے ہیں

لوگ محبّت کرنے والے!

بن جاتے ہیں نقشِ وفا کا

لوگ محبّت کرنے والے!

جھونکا ہیں بے چین ہَوا کا

لوگ محبّت کرنے والے!

جَلی ہُوئی دَھرتی پہ جیسے بادل گھِر کر آئیں

بستی پر ہیں فضلِ خُدا کا

لوگ محبّت کرنے والے!

درد کے رشتے عجب ہیں

دردکے رشتے عجب ہیں

کوئی اِن کی حد نہیں

کوئی ان کی تہہ نہیں ہے

اور کوئی سرحد نہیں

"یہ "زماں" اور یہ" مکاں "

یہ قربتیں ، یہ دُوریاں !

دُور تک بچھتی زمیں اور اُس پہ پھیلا آسماں !"

درد کے رشتوں کے آگے ان کی ساری وسعتیں

ریت کے اِک بے ٹھکانہ ذرّے سے زیادہ نہیں

اس گھڑی چاروں طرف اِک ہجر کا آشوب ہے
میرے تیرے درمیاں اِک خواب سینہ کوب ہے!

پھر بھی اے جانِ سخن !
جس طرح اہلِ سخن کی گفتگو
کتنی صدیوں کی مُسافت ایک پَل میں کاٹتی ہے
تیری میری خواہشوں میں، اپنے دُکھ سُکھ بانٹتی ہے
اور جیسے
اجنبی سی کہکشاں سے ڈولتے تارے کی ضَو
روشنی رفتار سے چلتی ہوئی ہم تک پہنچتی ہے
اور جیسے کچُھ پرندے
موسموں کے ساتھ اُڑتے
اپنی اپنی منزلوں کے راستوں پر
مستقل پرواز کرتے ہیں
کبھی کی منتظر اور مُضطرب شاخوں کی

سیجوں پر اُترتے ہیں

ہمارے خواب بھی (ان کی طرح)

اِک دن ہمارے "ہست" کی شاخوں پہ اُتریں گے

دھنک کے رنگ ان بھیگی ہوئی آنکھوں پہ اُتریں گے

کہ رشتے دَرد کے،

منزل بھی ہیں قطبی ستارا بھی!

ہمارے خواب کی تجسیم بھی ہیں

استعارا بھی!

ہر موسم کا سپنا

موسم موسم آنکھوں کو اِک سپنا یاد رہا
صدیاں جس میں سمٹ گئیں وہ لمحہ یاد رہا
قوسِ قزح کے رنگ تھے ساتوں اُسکے لہجے میں
ساری محفل بھول گئی، وہ چہرا یاد رہا

———

ہم ایسے مرگِ طلب بھی نہ تھے محبّت میں

ہم ایسے مرگِ طلب بھی نہ تھے محبّت میں
کہ جلتی آگ کے دریا میں بے خطر جاتے
(یقین جان، مری جاں کہ ہم ٹھہر جاتے)
تمھاری آنکھ کے آنسو تھے، سیلِ آب نہ تھا
چھلک بھی جاتے اگر، رزقِ خاک ہو جاتے
(مثالِ قطرۂ شبنم، چمکتے، کھو جاتے)
رہا وہ حرفِ وفا جس کی سبز کونپل پر
تمُھارے بوسۂ لب سے گلاب جاگے ہیں
(سو وہ گلاب تو کونپل سے کٹ بھی سکتے ہیں)
رہے وہ خواب جو آنکھوں کے آبگینوں میں
دھنک کے رنگ لیے ڈولتے سے رہتے ہیں

(سوایسے خواب تو آکر پلٹ بھی سکتے ہیں)

سو بات حرفِ وفا کی ہے اور نہ خوابوں کی
نہ ڈولتے ہُوئے رنگوں سے پُر گلابوں کی
سمے کے چڑھتے اُترتے ہُوئے سمندر میں
سب ایک پَل کی حقیقت
سب ایک پَل کا سراب
دلوں میں ترکِ تمنّا کا حوصلہ ہو اگر
تو کیسا حرفِ وفا!
اور کہاں کے خواب و گلاب!!
یہ کیسے دشتِ ندامت میں گھر گئے اے جاں
کہ اِک تو ترکِ تمنّا کا حوصلہ بھی نہیں
اور اس پہ یہ بھی قیامت
اگر ___ بفرضِ محال
تمُھاری راہ سے پھرنے کا حوصلہ بھی ملے!
پلٹ کے جائیں کہاں، گھر کا راستہ بھی ملے!!

ہری بھری اِک شاخ بدن پر

ہری بھری اِک شاخِ بدن پر
میرے لبوں کے لمس سے پُھوٹے
ایسے ایسے پُھول
سادہ سے ملبوس میں بھی وہ ساتوں رنگ کِھلاتی ہے
اپنے حُسن کی تیز مہک سے
لوگوں کے انبوہ میں بیٹھی یوں گھبرا سی جاتی ہے
جیسے باتیں کرتے کوئی!
جاتا ہے کُچھ بُھول
میرے لبوں کے لمس سے پُھوٹے
ہری بھری اِک شاخِ بدن پر
کیسے کیسے پُھول!

جب آنکھیں بُجھ کر راکھ ہُوئیں

جب آنکھیں بُجھ کر راکھ ہُوئیں
جب دل کا جوالا سرد پڑا
جب شام و سحر کے صحرا میں
خوابوں کے سارے ریت ہُوئے
جب عمرِ رواں کے میداں میں
سب زندہ جذبے کھیت ہُوئے
اُس وقت مجھے محسوس ہُوا
"جس عشق میں ساری عمر کٹی شاید وہ نظر کا دھوکا تھا
کرنوں سے کسی کے لہجے میں تنویر تھی میری اپنی ہی
شب تاب بدن کے جادُو میں خُود میرے لہو کا نشّہ تھا"

کل رات مگر جب کھڑکی پر
مہتاب نے آکر دستک دی
خُوشبو کی طرح لہرانے لگی
ہر سمت کوئی سرگوشی سی

"جب آنکھیں بجھنے لگتی ہوں، جب دل کا جوالا سرد پڑے
اُس وقت کسی کو کیا معلوم، کون اپنا کون پرایا تھا!
لہجے میں نشہ تھا کس کے سبب اور کس نے کسے مہکایا تھا!"

مشورہ

لذیذ ہو تو حکایت دراز تر بھی کروں
زوال کی ہے شکایت سو اس زمانے میں
ہے کون جو اِسی نعمت سے بہرہ مند نہیں
دہانِ خشک سے تلخی ملے گی، قند نہیں

تو آؤ آج سے یہ رسمِ گفتگو چھوڑیں
عنانِ وقت کو تھامیں خود اپنے ہاتھوں میں
بہت نہیں تو ذرا سا ہی اس کا رُخ موڑیں!

گلیڈی ایٹرز

ہم اپنے قتل ہونے کا تماشا دیکھتے ہیں
تو اپنی تیز ہوتی سانس کے کانوں میں کہتے ہیں
"ابھی جو ریت پر لاشہ گرا تھا
میں نہیں تھا — !
میں تو زندہ ہُوں — یہاں
دیکھو،
مری آنکھیں، مرا چہرہ، مرے بازو،
سبھی کچُھ تو سلامت ہے"!!

(۲)

ابھی کل ہی کا قصّہ ہے

سرِ مقتل ہمارے دست و بازو کٹ رہے تھے

پہ ہم اپنے گھروں میں مطمئن بیٹھے ہُوئے

ٹی وی کے قومی نشریاتی رابطے پر

سارے منظر دیکھتے تھے

اور یہ کہتے تھے

"نہیں یہ ہم نہیں ہیں"

ہماری آستیں پر خُون کے دھبّے ابھی تازہ ہیں

سُوکھے بھی نہیں!

خوابِ سراب

اب جو سوچیں بھی تو خوف آتا ہے
کس قدر خواب تھے جو خواب رہے
کس قدر نقش تھے جو نقشِ سراب رہے
کس قدر لوگ تھے جو
دل کی دہلیز پہ دستک کی طرح رہتے تھے
اور نایاب رہے!

کِس قدر رنگ تھے جو
بند گلیوں کے خم و پیچ میں چکراتے رہے
اپنے ہونے کی تب و تاب میں لہراتے رہے

پر کبھی آپ سے باہر نہ ہُوئے
پھُول کے ہاتھ پہ ظاہر نہ ہُوئے!
دِل کے گِرداب میں ٹوٹے ہُوئے پتّوں کی طرح
ہمہ تن رقص رہے
خُون کے سُرخ میں بے نام ستاروں کی طرح
عکس در عکس رہے

کیسے آدرش تھے جن کے سائے
سنسناتے ہُوئے تیروں کی طرح چلتے تھے
ہست اور نیست کے مابین عجب رشتہ تھا
رُوح کی آگ بھڑکتی تو بدن جلتے تھے!

وہ شب و روز تھے کیا،
جب کسی خواہشِ بیدار کی طغیانی میں
وقت کی قید سے لمحات نکل جاتے تھے

خُون میں جب بھی سُلگتا تھا ارادہ کوئی

آہنی طوق، تمازت سے پگھل جاتے تھے' !

(۲)

آنکھ کے دشت میں اب لاکھ الاؤ دہکیں

رُوح کی برف پگھلتی ہی نہیں

اب وہ آدرش کبھی

وقت کی اوٹ سے جھانکیں بھی تو یوں جھانکتے ہیں

جس طرح ٹوٹتا تارا کوئی

ایک لمحے کے لیے کوند کے چُھپ جاتا ہے !

کس قدر خواب تھے جو خواب رہے !

اب جو سوچیں بھی تو خوف آتا ہے ۔

اُس رات آسمان پہ تارے تھے اِس قدر

اُس رات آسماں پہ تارے تھے اِس قدر
دُشوار ہو رہا تھا سفر ماہتاب کا
آنکھوں میں جھلملاتے ہُوئے آنسوؤں کے پار
انگڑائی لے کے پھیل رہا تھا چہار سُو
اک بے کنار ہجر کا دشتِ چمن نما،
اٹکی ہُوئی تھی نخلِ تمنّا کی شاخ پر
فصلِ پریدہ رنگ کی مَسلی ہُوئی قبا
اِک اجنبی دُعا

کھلنے لگے تھے دستِ ہَوا پر خزاں کے پھُول
(جاتی ہُوئی بہار کے ٹوٹے ہُوئے اُصول)
چہرہ اَزل کی آگ تھا آنکھیں اَبد کی دُھول !

(۲)

اُس رات ٹوٹتے ہُوئے تاروں کی گونج میں
ہم کتنی دیر چلتے رہے ، کچُھ پتہ نہیں
کب تک ہم اپنے اَن کہے لفظوں کی کرچیاں
فرشِ ہَوا سے چُنتے رہے ، کچُھ پتہ نہیں!

شبنم کے ساتھ جو چمکے تمام شب
تارے تھے وہ کہ عکس مرے آنسوؤں کے تھے!
کیوں قربتوں کے شور میں گھٹنے لگا تھا دم
قسمت کے تھے کہ حلقے ترے بازوؤں کے تھے
کچُھ پتہ نہیں !

(۳)

گرد اس قدر ہے آئینۂ ماہ و سال پر
خوابوں کے عکس اپنے خد و خال کھو گئے

آنکھوں کے رنگ لے گئی تاروں کی روشنی
چہروں کے نقش ریت کی تحریر ہو گئے

تکتے تھے دِل کی سمت جو قرنوں کی اوٹ سے
بے نام خواہشوں کے وہ موسم بدل گئے

سُورج غروب ہو گئے، مہتاب ڈھل گئے
اُس بے کنار ہجر کا دشتِ چمن نما

تمثالِ دشتِ کرب و بلا بن چُکا ہے اب
طائر شہید ہو چُکے، اشجار جل گئے

(۴)

یہ سچ ہے لوحِ وقت پہ تحریرِ موجِ رنگ
نقش و نگارِ آب کی صُورت ہے برق پا
اِک بار پُل تلے سے جو پانی گزر گیا
سمجھو کہ مَر گیا

ساحل کا جھاگ ہو کے مٹے یا کہ رزقِ ابر

آتا نہیں پلٹ کے کبھی، جو گیا ___ گیا

لیکن یہ کیا کہ آج بھی جس رات ماہتاب

تاروں کے بے کنار میں رستہ نہ پا سکے

آنکھوں میں جھلملاتے ہُوئے آنسوؤں کے پار

ملتی ہیں اس طرح سے زمانوں کی سرحدیں

چلتا نہیں پتہ،

ہم پیچھے رہ گئے ہیں کہ آگے نکل گئے ___!

رُو بَرُو

اپنے خوابوں کی دہلیز پر مضمحل
کب سے بیٹھے ہیں عشّاق
ژَولیدہ مُو اور پَژ مُردہ دل
رسمِ بخیہ گری
شہرِ کم رزق میں اِس طرح سے بڑھی
بُھوک کے زخم بھی سلکِ ایمان سے لوگ سینے لگے
سلکِ ایمان کھنچ کھنچ کے تنتا گیا
اس قدر تن گیا

ہر گھڑی دِل میں رہتا ہے یہ وسوسہ
یہ اگر ٹوٹ کے
وقت کے کپکپاتے ہُوئے ہاتھ سے چھُوٹ کے
بُھوک کے اِس جہنّم کے پاتال میں گر گیا
تو یہ تنّور جس میں
شب و روز نانِ جویں کے لیے، خود بھی
نانِ جویں کی طرح سُرخ شعلوں میں بنتے
بگڑتے ہیں اِنساں،
سلکِ ایمان کو اور اُس کے کناروں سے لپٹی ہُوئی بے اماں خلق کو
ہیزمِ خشک کی مثل کھا جائے گا ــــ

تار پر چلنے والے نٹوں کی طرح
ہم بھی تنّور کے مُنہ پہ تانے ہُوئے
سلکِ ایمان پر محوِ رفتار ہیں
(زندہ تاریخ بھی ایک سُورج ہے پر

اُس کا نورِ جہاں تاب اُن کے لیے
ہے جو سُورج مکھی کی طرح ہر نفَس
رُو بہ خورشید ہیں)
ہم کہ خُود اپنی تاریخ پر بوجھ ہیں
اپنے کمزور کاندھوں پہ تاریخ کا بوجھ لادے ہُوئے
(جس میں آبا کے بُھولے ہُوئے نقش ہیں
اِک حقیقت نما خواب کے عکس ہیں — اور کچُھ بھی نہیں)
معجزوں کے لیے
اپنی آنکھوں کی جھولی پسارے ہُوئے، خواب اوڑھے ہُوئے
آنے والے دنوں کی طرف پیٹھ موڑے ہُوئے
ہیں رواں بے جہت
بے نوا اور خجل،
اپنے ہونے کے آشوب سے منفعل

رسمِ بخیہ گری

شہرِ کم رزق میں اِس طرح سے پڑی
خواہشیں بے عمل
آرزو پابہ گِل
اپنے خوابوں کی دہلیز پر مضمحل
کب سے بیٹھے ہیں عشّاق
ژولیدہ مُو اور پژمردہ دل !

ایک خواب کے ٹوٹنے پر!

نہ کوئی حرف رہا معتبر نہ شکل کہ ہم
کسی سخن، کسی صحبت پہ افتخار کریں!
تمام آئینے دُھندلا گئے ہیں شہروں میں
نہ کوئی نقش ہے سالم نہ کوئی عکس کہ ہم
کسی نظر، کسی چہرے پہ اعتبار کریں

یہ کیسے شک کا عذاب گراں پڑا ہم پر
خجل ہُوئی ہے بصیرت، بصارتیں نادم
ہر ایک حرفِ دُعا، بے نوا گدا کی طرح
خُود اپنے خوابِ حضوری کی بازگشت میں گُم

فصیلِ لب پہ کھڑا ہے اِسی تذبذب میں
ابھی کواڑ کھُلیں گے درِ مسیحا کے !

ابھی وہ دستِ کرم ،
کھُلے کواڑ کی خندہ جبیں سے جھانکے گا
مگر یہ خوف کہ زنجیرِ در کی جُنبش بھی
ہَوا کے ڈولتے لمحے کی کوئی چال نہ ہو
لہو میں چور کی صُورت نقب لگاتا ہے !

کٹی ہے ایسے دُھندلکوں میں زندگی اپنی
کہ صُبح و شام کے تارے کا فرق یاد نہیں
ہے پُراُمید بھی خلقت، دِلوں میں خوف بھی ہے
سحر کے جال کے پیچھے شبوں کا جال نہ ہو!
کہ یہ سَفر بھی شہیدِ رہِ ملال نہ ہو!
تمام شہر کی خلقت یہی دہائی دے
رہائی دے ہمیں مولا ، ہمیں رہائی دے

دلوں کی تہہ میں چھُپے بھید جاننے والے
تری نگاہ پہ روشن ہیں ایسی تحریریں
کہ جن کے حرف کسی لوح پر لکھے نہ گئے

وہ اپنے عہد میں قائم نہیں رہا لیکن
جو خواب اُس نے دکھایا ہے وہ تو سچّا تھا
ہر ایک رُوح کی ڈوری ہے تیری مٹھی میں
اُسے گھٹا کہ بڑھا یہ تری مشیّت ہے
پر اُس کے خواب کے رستوں میں روشنی رکھنا
کوئی چراغ بُجھے یا جلے مگر مولا!
مرے وطن کی فصیلوں میں روشنی رکھنا

عِلموں بس کریں او یار!

عِلم کی روشنی میرے چاروں طرف پھیلتی ہے ،
اس کی عکسی شعاعیں ہر اِک شے کے باطن
کو ظاہر میں تبدیل کرتی ہیں — میں
اِنکشافات کے ایک آتش فشاں کے دہانے پہ ہوں
میرے چاروں طرف دُھوپ ہے !
میری اقدار کے سبز چشموں پہ صحراؤں کی ریت خیمہ فگن ہے
ہواؤں کے لہجے میں تلخی کا اعلان ہے
اور درختوں کے سائے بھٹکتے ہُوئے قافلوں کے تعاقب
میں صحرا کی پہنائیوں میں کہیں کھو چکے ہیں

٭ بابا بلھے شاہ کی کافی سے لیا گیا ہے ۔

جس قدر خواب تھے
گرد بادوں کی دہلیز پر سو چکے ہیں

اے خُدا،
اے سمندر کی گرہوں کے عقدہ کُشا
میرے چشموں سے ریگِ رواں کے یہ خیمے ہٹا
ان کو پانی سے بھر
میرے پیڑوں کو سائے کی توفیق دے
گردِ بادوں کی دہلیز پر سو چکے خواب کو
اُس کی تعبیر دے
پھر ہواؤں کے لہجے میں سینوں کے دَر
کھول دینے کی گمُ گشتہ تاثیر دے

اے خُدا — میرے رب!
میرے اُونٹوں کے لب، پیاس سے خُشک ہیں

آسماں پر مرے نام کا کوئی بادل نہیں

اور چاروں طرف دُھوپ ہی دُھوپ ہے !

میری ایڑی کو بھی کوئی چشمہ جگانے کا اعجاز دے !

میرے بے صوت لفظوں کو آواز دے !

میری پتّھر مسافت کو آغاز دے !

اور اگر یہ نہیں

تو مری آنکھ کے اِس الاؤ کو بھی، خُشک مٹّی سے بھر

مجھے اس جہنّم سے آزاد کر

مُجھے عِلم کے اس جہنّم سے آزاد کر — !!

اے شام گواہی دے

بوسوں کی حلاوت سے جب ہونٹ سُلگتے ہُوں
سانسوں کی تمازت سے جب چاند پگھلتے ہُوں
اور ہاتھ کی دستک پر
جب بندِ قبا اُس کے، کھُلنے کو مچلتے ہوں!
عشق اور ہوس کے بیچ، کچھ فرق نہیں رہتا
(کچھُ فرق اگر ہے بھی، اُس وقت نہیں رہتا)
جب جسم کریں باتیں، دریا بھی نہیں بہتا
میں جھُوٹ نہیں کہتا
اے شام گواہی دے

آج پُورے چاند کو دیکھا تو یاد آیا مجھے

آج پُورے چاند کو دیکھا تو یاد آیا مجھے

تم بھی اُس شب

اِک چھلکتے جام کی صُورت لبالب تھے

تُمھارے جسم کی قوسیں

تُمھارے خُوبصُورت جسم کی سب دِلرُبا قوسیں

کچُھ ایسے زاویے پر ایک لمحے کو رُکی تھیں

جس طرح ، بادل کے کونے پر

لرزتے چاند کی آنکھیں ،

لرزتے چاند کی اَرماں بھری ، حیرت زدہ آنکھیں

تمھارا حُسن

اِک سیّال بجلی کی طرح
ملبوس کی شکنوں میں ایسے مُضطرب تھا
چاندنی کو، اپنے ہی رنگوں سے جیسے راستہ ملتا نہ ہو
جس طرح جادُو سے کوئی
سیل سے اُٹھتی ہُوئی اِک موج کو
مدّتوں سے پیاس کی ماری ہَوا میں روک دے

اور اگر تُم
اپنی اُس انگڑائی میں
اُن جھیل سی گہری نگاہوں سے
فلک کی سمت کوئی آس کا طائر اُڑاتے
مُسکرا کر چاند کو آواز دیتے
تو یقیں جانو وہ بادل کی فصیلیں توڑتا
اَن گنت تاروں کے اس جھُرمٹ کو پیچھے چھوڑتا

آسماں کی شاخ سے پرواز کرتا اور چلا آتا

تمھارے در پہ سائل کی طرح آواز دیتا

اور پھر عشّاق کی صَف میں کھڑا

شامِ اَبد تک منتظر رہتا

کہ تم اُس کے لیے دروازہ کھولو

اور اُسے اندر بلاؤ

ہاں یقیں جانو

کہ اُس لمحے تمھارا حسن امکاں کی حدوں سے ماورا تھا

ایک زندہ معجزہ تھا،

(۲)

دم بدم بُجھتے ہُوئے لمحوں کے آتشدان میں

معجزوں سا حسن خاکستر ہُوا،

اجنبی تارے، سحر کے کھیت میں

بارش کے بے تعبیر قطروں کی طرح مٹی ہُوئے

بے ثمر جذبوں سے بوجھل چاند لکڑی کی طرح
خُورشید کے تنّور میں ایندھن بنا !

(یہ ہمارے روز و شب بھی
بے ثمر جذبوں کا ایندھن ہی تو ہیں !)

(۳)

آج پُورے چاند کو دیکھا تو یاد آیا مجھے
کیا خبر اس بیچ ، کتنے چاند بے چہرہ ہُوئے
وہ جو بادل کے کنارے پر
کسی انگڑائی کی صُورت میں لرزا تھا
کہاں کا تھا ــــــ کہاں ہو گا !
کہ اب تو آسماں پر اَن گِنت تاروں کے جُھرمٹ میں
فقط اِک دائرہ ہے
ایک تنہا دائرہ ہے
جس کی وحشت سے بھری

آنکھوں کے سُونے آئینے میں

کوئی روشن عکس لہرایا نہیں

اور تاحدِّ نظر

اَبر کا سایا نہیں !!

خُوشحال خاں خٹک کے لیے ایک نظم

زمیں دُلہن ہے
اور افلاک کی اِن بے ٹھکانہ وُسعتوں میں
جس قدر تارے ہیں اُس کی اوڑھنی کی
جھلملاہٹ سے بنے ہیں !
یہ ستارے ، اِستعارے ہیں
ہماری آپ کی اِس زندگی کا
(جس کے ہونے اور نہ ہونے کے تذبذب میں
اَزل سے تا ابد تاریخ کے جالے تنے ہیں

ستارے سانس لیتے ہیں !

ستارے بھی ہماری آپ کی صُورت فضا میں سانس لیتے ہیں

ہماری ہی طرح یہ بھی فنا کی کوکھ میں تخلیق ہوتے ہیں

چمکتے ہیں، دمکتے ہیں، خلا کا رِزق بنتے ہیں !

ہماری آپ کی یہ داستاں تو

ٹوٹتے تاروں کی اِس وحشی چمک کے اِستعارے

میں سمٹ جاتی ہے لیکن سب ستارے

اِتنے بے مایہ نہیں ہوتے !!

کئی مہتاب خُو سُورج بکف ایسے بھی ہوتے ہیں

کہ جو خُود ٹوٹ بھی جائیں تو اُن کی

روشنی موجود رہتی ہے

صدائے بازگشت اُن کی ہَوا کے ساتھ بہتی ہے

وہ اپنی موت سے لوحِ ابد پر زندگی تحریر کرتے ہیں

فنا تسخیر کرتے ہیں!

مرے خُوشحال کے نغمے بھی اِک ایسے ہی لافانی ستارے

کی ضیا ہیں

مری مٹی کے چہرے کی حیا ہیں !

اِنہی نغموں کے پَرتو سے اُمنگیں جگمگاتی ہیں

اِنہی سے اس زمیں کی آنکھ میں دُلہن کی آنکھیں مُسکراتی ہیں

اِسی تارے کی مِشعل سے ہے اپنا تن بدن روشن !

کرن اندر کرن روشن !

مِرے خُوشحال کے نغموں سے ہے میرا وطن روشن !

کیا کبھی تم نے سوچا ہے

جب یونہی بے ارادہ
کبھی باتیں کرتے
مِرا ہاتھ اُس کے بدن پر کہیں چھُو سا جائے
تو لگتا ہے جیسے مری اُنگلیوں میں
یکایک بہت سے دیئے جل اُٹھے ہیں

کبھی یونہی جب
باتیں کرتے ہوئے
ایک دم رُک سے جائیں
اور اِک دُوسرے سے کہیں ،
” ہاں تو کیا بات تھی وہ . . . . .
چند لمحے اُسے
یاد کرنے کی ناکام کوشش کریں اور پھر
اس طرح ہنس پڑیں
جیسے باتوں کا مقصد
فقط ایک دُوجے کی قربت میں رہنا
اور اُس اجنبی بے تعارف سے لمحے کی آہٹ سے بچنا
ہو جس کے سبب ، دل کی دھڑکن کبھی
ایڑیوں اور کبھی ، سر سے اس طرح آتی ہے
جیسے یہیں اُس کا مسکن ہو ، گھر ہو
یہیں اس کی منزل یہیں رہگزر ہو ـــــ

(۲)

جانِ جاں ___ میں نے سوچا بہت ہے !
تُمھاری قسم ،
میں نے اُن سارے لمحوں کو، ژولیدہ لمحوں کے بکھرے ہُوئے موتیوں کو
شب و روز کے بے ٹھکانہ تسلسل کی تسبیح میں
دانا دانا پرویا بہت ہے
(خود کو کھویا بہت ہے)
مگر جب بھی میں اس نشاطِ الم آفریں سے گزُرتا . . . .
گزرنے کی کوشش یا تدبیر کرتا ہوں تو
ایک دیکھا ہُوا بے تعارف سا لمحہ
کوئی اجنبی سا خیال آ کے دامن پکڑتا ہے
میں یاد کرتا ہوں
میں یاد کرنے کی بھرپور کوشش میں

ٹوٹے ہُوئے، ریزہ ریزہ بدن آئنے کی طرح
سارے عکسوں کو ترتیب دیتا ہوں پر
شکل بنتی نہیں
شکل بنتی نہیں اور ژولیدہ لمحوں کے آشوب میں یاد آتا نہیں
مجھ کو کچھ ٹھیک سے یاد آتا نہیں
وہ تعلق مری رُوح کا عطر تھا
یا فقط جسم کی
بے ٹھکانہ صدا تھی!
تمھاری قسم، اُس سَمے کی قسم
مجھ کو کچھُ ٹھیک سے یاد آتا نہیں!!

دن بہت جا چکے ہیں اور اب جانِ جاں
تم بھی میری طرح
زندگی کے سب اُس نوع کے تجربوں سے یقیناً گزر آئی ہو
جنھیں لوگ

گم گشتہ جنّت میں گیہوں کے دانے سے نکلی ہُوئی
داستاں کے حوالے سے تفسیر کرتے ہیں !
تمھیں بھی . . . . .
(اور اس "تم" سے میں خُود کو منفی نہیں کر رہا)
ان حقائق پہ اور اُن کی تفسیر پر پختہ ایمان ہو گا !
مگر جانِ جاں
کیا کبھی تُم نے سوچا ہے
وہ لمس کیا تھا !'
جو پَوروں میں تارے جگاتا ہُوا، مُسکراتا ہُوا
از ازل تا اَبد پھیلتا تھا
(پھیلتا تھا مگر کچُھ بتاتا نہ تھا ۔ ہاتھ آتا نہ تھا)
اور چُھپ کے وہ سب بے کنارا جزیرے
جو باتوں کے بے نام، گہرے سمندر
میں یوں ڈولتے تھے
کہ پورے بدن میں بدن بولتے تھے
وہ کیا تھے !!!

تاریخ

سُورج نکلا

اور سُورج کے ساتھ درختوں کی شاخوں سے

آوازوں کے پھُول کِھلاتے طائر نکلے،

حُسنِ ازل کے شاعر نکلے!

سُورج کا رتھ اپنا چکّر پُورا کر کے نکل گیا ہے

لیکن طائر

اس کے سفر کی جِھلملتا میں

اپنی سمت گنوا بیٹھے ہیں!!

اپنے خواب لُٹا بیٹھے ہیں!!

شام درختوں کے آنگن میں اُتر رہی ہے ،
لیکن اُن سے دُور ، نہ جانے کتنی دُور
وہ گم کردہ راہ پرندے
(رُکی ہُوئی ہے جن کے لبوں پر ایک سُلگتی چیخ !
جمی ہُوئی ہے جن کے پَروں پر سُورج رتھ کی دُھول)
تھک کر گرنے کے لمحے میں سوچ رہے ہیں
کل سُورج پھر
اُن کے گھروں پر دستک دے گا
اور درختوں کی شاخوں سے، ان کے بچّے
آوازوں کے پھُول کھِلاتے نکلیں گے !!!

یہ بستی

زندگی بھی مہنگی ہے موت بھی نہیں سستی

یہ زمینِ بے سایہ

گِھر گئی خُدا جانے کِن عجب عذابوں میں

بے وجود سایوں کا یہ جو کارخانہ ہے

کن عجب سرابوں میں کس طرف روانہ ہے؟

نیستی ہے یا ہستی!

زندگی بھی مہنگی ہے، موت بھی نہیں سستی!

اِس بستی کے ہر آنگن میں

ایک ہی جگنو بھٹک رہا ہے تاریکی کے گھیرے میں
ایک ہی تارا چمک رہا ہے چاروں اور اندھیرے میں
ایک ہی سپنا ہمک رہا ہے لاکھوں بجھتی آنکھوں میں
زخمی، خالی ہاتھوں میں

ٹُوٹ رہا ہے حلقہ حلقہ زنجیروں کا جال
پگھل رہے ہیں قطرہ قطرہ، گمنامی کے طوق
سمٹ رہا ہے لقمہ لقمہ اس بستی سے کال

اطہر نفیس کے لیے ایک نظم

وہ ایک ہمدرد آئنہ تھا
کہ اُس کی آنکھوں میں جو بھی اِک بار دیکھتا تھا
یہ سوچتا تھا،
وہ اب اکیلا نہیں رہا ہے!!
عجب تسلّی بدوش تھیں وہ نگار آنکھیں
وہ زندگی کی اُمید، روشن نوید ایسی بہار آنکھیں
جو سوگئی ہیں!
وہ رتجگوں کے دُھوئیں میں لپٹا اُداس چہرہ
مگر وہ آنکھیں

وہ آگہی کی سفیر آنکھیں جو کھو گئی ہیں
وہ جس کے لفظوں میں چاہتوں کے چراغ جلتے تھے
بُجھ گیا ہے!

وہ جس کے لہجے میں پھُول کِھلتے تھے
اُس کی آواز جل گئی ہے

وہ دوستی کا شفیق موسم
وہ روشنی کی لکیر، آگے نِکل گئی ہے

وہ اِک جزیرہ تھا دوستی کا
جو ہولے ہولے سمندروں کے نمک کی چھُریوں سے کٹ رہا تھا!
اُلجھتی سانسوں کے زیر و بم میں
وہ روز و شب کے اُداس صفحے اُلٹ رہا تھا
ہماری آنکھوں میں پھیلنے کو سمٹ رہا تھا۔

اُن جھیل سے گہری آنکھوں میں

اُن جھیل سے گہری آنکھوں میں اِک شام کہیں آباد تو ہو!
اُس جھیل کنارے پَل دو پَل
اِک خواب کا نیلا پھُول کِھلے!
وہ پھُول بہا دیں لہروں میں
اِک روز کبھی ہم شام ڈھلے
اُس پھُول کے بہتے رنگوں میں
جس وقت لرزتا چاند چلے!

اُس وقت کہیں اُن آنکھوں میں اُس بسرے پَل کی یاد تو ہو!
اُن جھیل سے گہری آنکھوں میں اِک شام کہیں آباد تو ہو!

پھر چاہے عُمر سمندر کی
ہر موج پریشاں ہو جائے!
پھر چاہے آنکھ دریچے سے
ہر خواب گریزاں ہو جائے!
پھر چاہے پُھول کے چہرے کا
ہر درد نمایاں ہو جائے!

اُس جھیل کنارے پَل دو پَل وہ رُوپ نگر ایجاد تو ہو!
دن رات کے اِس آئینے سے وہ عکس کبھی آزاد تو ہو!
اُن جھیل سے گہری آنکھوں میں اِک شام کہیں آباد تو ہو!

سُنو پیارے

سُنو پیارے،
محبّت کرنے والوں کی نگاہیں بھی
ہَوا میں ڈولتی خُوشبو کی صُورت منظروں میں
اپنے ہونے کی نشانی چھوڑتی ہیں
چاندنی راتوں میں جیسے
چاند کی کرنیں
سمندر کے بدن میں نغمگی آباد کرتی ہیں

محبّت کرنے والوں کے تعلّق اور اُن کی دُوریاں سب سے
انوکھی ہیں

کہ جیسے بے خبر سُورج کے حلقے ہیں
اگرچہ اَن گنت تارے، کئی سیّارگاں ہیں
اور پھر حلقہ بہ حلقہ اُن کے اپنے چاند ہیں لیکن
سبھی اِک رشتۂ بے نام کی ڈوری میں ایسے مُنسلک ہیں
جس طرح عشّاق کی آنکھیں

سُنا ہے عورتیں تو
چاہنے والے کی خُوشبُو
بے کراں انبوہ میں پہچان لیتی ہیں
محبّت کی نظر، ملنے سے پہلے جان لیتی ہیں'
مگر پیارے ۔۔۔۔۔۔!

ساحل

تُمھارے نام کے حرفوں سے بہتر حرفِ ابجد میں نہیں ہیں
نجانے کب سے یہ موسم
ستاروں کی طرح دھرتی کے سینے پر فروزاں ہیں
مگر اُن کی نگاہوں نے
تمھارے وصل کے لمحوں سے بہتر وقت
دیکھا ہے نہ سوچا ہے
ہَوا نے منظروں پر آج تک جو کچھُ بھی لکھا ہے
تمُھارے نام لکھا ہے

خلا میں ٹوٹتے تارے، تمھارے بام سے گزریں
تو رُکنے کو مچلتے ہیں
فلک کو چُومتے جذبے تمھاری آنکھ سے اُتریں
تو پاتالوں میں گرتے ہیں
تُمھارے خواب سے روشن منارے
وقت کے دریائے بے حد میں نہیں ہیں
تُمھارے نام کے حرفوں سے بہتر حرف ابجد میں نہیں ہیں

آبلہ

اُداسی کے اُفق پر جب تمھاری یاد کے جُگنو چمکتے ہیں
تو میری رُوح پر رکھا ہُوا یہ، ہجر کا پتّھر
چمکتی برف کی صُورت پگھلتا ہے!
اگرچہ یوں پگھلنے سے یہ پتّھر، سنگریزہ تو نہیں بنتا!
مگر اِک حوصلہ سا دل کو ہوتا ہے،
کہ جیسے سربسر تاریک شب میں بھی
اگر اِک زرد رُو، سہما ہُوا تارا نکل آئے
تو قاتل رات کا بے اسم جادُو ٹُوٹ جاتا ہے

مُسافر کے سَفر کا راستہ تو کم نہیں ہوتا

مگر تارے کی چلمن سے

کوئی بُھولا ہُوا منظر اچانک جگمگاتا ہے!

سُلگتے پاؤں میں اِک آبلہ سا پُھوٹ جاتا ہے۔

دو مُختصر نظمیں

محبّت

محبت ایسا دریا ہے

کہ بارش رُوٹھ بھی جائے تو پانی کم نہیں ہوتا

سلام

سدا معتبر،

وہی چند سر،

جو اُگے ہیں شاخِ صلیب پر

اَن کہا لفظ

جانِ مَن ،

کل سرِ گفتگو تیری اِن خوش نما

وحشی ہرنی سی آنکھوں کے ساحل پہ جو

اِک ستارا سا لرزا تھا

وہ رات بھر ،

یوں مرے جسم و جاں میں ترازو رہا

جیسے آنسو نہ تھا۔ نیم کش تیر تھا!

ایک زنجیر تھا

جس کا ہر حلقۂ آہنی

اِس قدر سرد اور مرگ تاثیر تھا

جیسے پھانسی کی شب
جیسے قاتل کا دل
جیسے خنجر کے لب !!

ہاں مری جان وہ قطرۂ شبنمیں
جو تری سرمہ سا
وحشی ہرنی سی آنکھوں میں اِک پَل کو لرزا تھا
میرے لیے
جیسے کانٹوں میں اُلجھی ہُوئی اِک صدی تھا
ایک ایسی ندی تھا
جو کوہِ الم سے سراسیمہ نکلے
اور افسوس کے دشتِ بے رنگ میں جذب ہو !

جانِ من، یُوں تو اِس کُرۂ اَرض پر
سینکڑوں ہی زبانیں، کروڑوں ہی الفاظ ہیں

مگر ہر زباں میں فقط ایک ہی لفظ ہے

جو سدا معتبر ہے

ازل کے تعلق کا پندار ہے ___ اُس کا معیار ہے

میں ترے سامنے اُس کو کیسے کہوں

یہ مری خامشی اُس کا اظہار ہے _!

ہاں سُنو جانِ من

زندگی کی طرح ___ آدمی بھی نہایت پُراسرار ہے

کہ جو دیکھو تو ہے

اور نہ دیکھو تو موجِ ہَوا کی طرح

ایک پَل میں اَزل ، دُوسرے میں اَبد

جیسے خوابوں کی حد

جیسے دل کی سند

کل سرِ گفتگو تیری اِن بے صدا

وحشی ہرنی سی آنکھوں میں بھی ایک پَل کے لیے

جو ستارا سا چمکا تھا وہ اصل میں
کہکشاں میں پرویا ہُوا لفظ تھا
میرا صدیوں کا کھویا ہُوا لفظ تھا ـــ

جانِ من !
کرۂ ارض پر جس قدر بھی زبانیں اور الفاظ ہیں
اُن کے دامن میں اِس لفظِ بے صَوت سے
خُوبصورت کوئی استعارہ نہیں

آسماں، آسماں،
اِس ستارے سے روشن ستارا نہیں
یہ اَزل کے سمندر کی وہ مَوج ہے
جس کا حدِّ ابد بھی کنارا نہیں ـــ

اِس وقت جو دریا ہے

ہم تُم بھی یہیں ہوں گے ، یہ پُل بھی یہیں ہو گا
اِس وقت جو دریا ہے ، کل صُبح نہیں ہو گا
آنسو کی طرح لمحے ، پلکوں پہ لرزتے ہیں
پھر وقت کے دریا میں اِس طرح اُترتے ہیں
پہنائی صحرا میں
جس طرح کوئی ذرّہ
بے نام ونشاں ہو جائے
ہونے کا گُماں ہو جائے

یہ جمتا ہُوا آنسو ــــ یہ ٹھہرا ہُوا لمحہ

اِک جھیل سی ہے جس میں

اِک وصلِ رمیدہ کے کچُھ پھُول مہکتے ہیں۔ کچُھ عکس لرزتے ہیں

یہ عکس لرزنے دے ــــ یہ پھُول مہکنے دے !

اِس جھیل کے ساحل پر اس چاند کو چلنے دے !

آنکھوں سے گرا آنسو ٹوٹا ہُوا پرچم ہے ،

ساحل کے اُدھر ہر سُو اِک ہجر کا موسم ہے

اُس ہجر کے موسم میں

یہ جھیل کہیں ہو گی ، یہ چاند کہیں ہو گا

اِس وقت جو دریا ہے ! کل صبح نہیں ہو گا !!

یہ جو ریگِ دشتِ فراق ہے

یہ جو ریگِ دشتِ فراق ہے یہ رُکے اگر
یہ رُکے اگر تو نشاں ملے ۔ یہ نشاں ملے
کہ جو فاصلوں کی صلیب ہے
یہ گڑی ہُوئی ہے کہاں کہاں !
مرے آسماں سے کدھر گئی ترے التفات کی کہکشاں
مرے بے خبر، مرے بے نشاں
یہ رُکے اگر تو پتہ چلے
میں تھا کِس نگر تُو رہا کہاں !

کہ زماں مکاں کی یہ وُسعتیں
تجھے دیکھنے کو ترس گئیں
(وہ مِرے نصیب کی بارشیں
کسی اور چھت پہ برس گئیں!)
مِرے چار سُو ہے غُبارِ جاں، وہ فشارِ جاں
کہ خبر نہیں مِرے ہاتھ کو مِرے ہاتھ کی
مِرے خواب سے ترے بام تک
تری رہگزر کا تو ذکر کیا
نہیں ضَوفشاں ترا نام تک!
ہیں دُھواں دُھواں، مِرے استخواں
مِرے آنسوؤں میں بجھے ہُوئے مرے استخواں
مرے نقش گر، مِرے نقشِ جاں

اسی ریگِ دشتِ فراق میں رہے منتظر ــــ ترے منتظر
مِرے خواب، جن کے فشار میں

رہی میرے حال سے بے خبر

تری رہگزر

تری رہگزر کہ جو نقش ہے مرے ہاتھ پر

مگر اس بلا کی ہے تیرگی

کہ خبر نہیں مرے ہاتھ کو مرے ہاتھ کی

وہ جو چشمِ شعبدہ ساز تھی وہ اُٹھے اگر

مرے استخواں میں ہو روشنی

اُسی ایک لمحۂ دید میں تری رہگزر

میری تیرہ جاں میں چمک اُٹھے

مرے خواب سے ترے بام تک

سبھی منظروں میں دمک اُٹھے

اُسی ایک پَل میں ہو جاوداں

مری آرزو کہ ہے بے کراں

مری زندگی کہ ہے مُختصر

یہ جو ریگِ دشتِ فراق ہے یہ رُکے اگر — !

تُم

تُم جس خواب میں آنکھیں کھولو
اُس کا رُوپ امر
تُم جس رنگ کا کپڑا پہنو
وہ موسم کا رنگ
تُم جس پھُول کو ہنس کر دیکھو
کبھی نہ وہ مُرجھائے
تُم جس حرف پہ اُنگلی رکھ دو
وہ روشن ہو جائے

جب

جب شب کے شکستہ زینوں سے مہتاب اُترنے لگتا ہے
جب غم کے سرد الاؤ میں اُمیدیں بجھنے لگتی ہیں،
جب دِل کے شوہ سمندر میں آوازیں مرنے لگتی ہیں،

جب موسم ہاتھ نہیں آتے جب تتلی بات نہیں کرتی
جب زندہ رہنا اِک بے معنی کام دکھائی دیتا ہے
جب آنے والا ہر لمحہ دشنام دکھائی دیتا ہے

جب یاد کے گہرے سنّاٹے میں چہرے گُم ہو جاتے ہیں

جب درد سے بوجھل آنکھوں میں گرداب سے پڑنے لگتے ہیں

جب شمعیں گُل ہو جاتی ہیں جب خواب بکھرنے لگتے ہیں

اُس وقت اگر تُم آ جاؤ !!

تم سچّے برحق سائیں

تم سچے برحق سائیں
سر سے لے کر پیروں تک
دُنیا شک ہی شک سائیں
تم سچّے ، برحق سائیں

اِک بہتی ریت کی دہشت ہے
اور ریزہ ریزہ خواب مرے
بس ایک مسلسل حیرت ہے
کیا ساحل ، کیا گرداب مرے!

اس بہتی ریت کے دریا پار

کیا جانے ہیں کیا کیا اسرار!

تم آقا چاروں طرفوں کے!

اور میرے چار طرف دیوار

اِس دھرتی سے افلاک تلک

تم داتا، تم ہو پالنہار

میں گلیوں کا گکھ سائیں

تم سچّے برحق سائیں

سر سے لے کر پیروں تک

دُنیا شک ہی شک سائیں!

(۲)

کچھ بھید اَزل سے پہلے کا!

کچھ راز ابد کی آنکھوں کے!

کچھ قصّہ ہجر سراپے کا

کچھ بھیگے موسم خوابوں کے!

کوئی چارہ میری پستی کا !
کوئی دارُو آنکھ ترستی کا !
بس ایک نظر سے جُڑ جائے
آئینہ میری ہستی کا
اَزلوں سے راہیں تکتا ہے
اِک موسم دل کی بستی کا
اُس کی اور بھی تک سائیں
تم سچّے برحق سائیں
سر سے لے کر پیروں تک
دُنیا شک ہی شک سائیں!
تم سچّے برحق سائیں

(۳)

میں ایک بھکاری لفظوں کا
یہ کاغذ ہیں کشکول مرے

ہیں ملبہ زخمی خوابوں کا

یہ رستہ بھٹکے بول مرے

یہ ارض و سما کی پہنائی

یہ میری ادھوری بینائی

کیا دیکھوں، کیسے دیکھ سکوں!

یہ ہجر کی جلوہ آرائی،

یہ رستہ کالے کوسوں کا

اور ایک مسلسل تنہائی

مانگوں ایک جھلک سائیں

تم سچّے برحق سائیں

سر سے لے کر پیروں تک

دُنیا شک ہی شک سائیں

تم سچّے برحق سائیں!

نئے لفظوں کی خُوشبُو

لکھوں وہ لفظ، کسی نے لکھے نہ ہوں اب تک
کروں وہ بات نہ جس سے ہو آشنا کوئی
چُنوں وہ رنگ جو پیدا نہیں ہُوئے، لیکن
یہ آگہی کے عَلَم کس لیے بلند کروں!

جو میرے ذہن میں جَلتا ہے اُس چراغ کی لَو
وہ روشنی تو نہیں جس کی آرزو لے کر
اَزل سے محوِ سفر ہیں یہ آدمی زادے
سیاہ بخت لیے ــــ رزق پائے باد بنے

دیارِ ذہن میں جلتے ہُوئے چراغ ، ٹھہر
تری ضیاء تو کوئی اور راہ پا لے گی
یہ موجِ سیل ہے ، رستہ نیا بنا لے گی
مگر یہ قبر سے تاریک بستیاں میری
یہاں چراغ نہیں ، سُورجوں کی حاجت ہے
ہمارے خُوں سے مہکتے ہُوئے جواں سُورج
زمانے بھر کے غریبوں کے ترجماں سُورج
جہاں جہاں ہے اندھیرا ، وہاں وہاں سُورج

میں ایسے نفظ لکھوں گا جو سب کے دل میں ہیں
فقط وہ بات کروں گا جو سب سمجھتے ہوں
اور ایسے رنگ چُنوں گا جو میری گِل میں ہیں

رات کی سانسیں ٹوٹ رہی ہیں

بھٹک رہے ہیں گُنج بدن میں
تِتلی بن کر ہاتھ
دل کی شاخ پہ چمک رہی ہے
شبنم سی اک بات

بِکھر رہی ہے لمحہ لمحہ
بُجھتے چاند کی پہنائی میں
وصل کی پہلی رات!

۱۹۷۷ء

فرض کرو

فرض کرو ہم تارے ہوتے
اِک دُوجے کو دُور دُور سے، دیکھ دیکھ کر جلتے بُجھتے
اور پھر اِک دن
شاخِ فلک سے گرتے اور تاریک خلاؤں میں کھو جاتے!

دریا کے دو دھارے ہوتے،
اپنی اپنی موج میں بہتے
اور سمندر تک اِس اَندھی، وحشی اور مُنہ زور مسافت
کے جادُو میں تنہا رہتے!

فرض کرو ہم بھور سمے کے پنچھی ہوتے ،
اُڑتے اُڑتے اِک دوجے کو چھوتے — اور پھر
کھُلے گگن کی گہری اور بے صرفہ آنکھوں میں کھو جاتے !

اَبرِ بہار کے جھونکے ہوتے ،
موسم کے اِک بے نقشہ سے خواب میں مِلتے
مِلتے اور جُدا ہو جاتے
خشک زمینوں کے ہاتھوں پر سبز لکیریں کندہ کرتے
اور اَن دیکھے سپنے بوتے
اپنے اپنے آنسو رو کر چَین سے سوتے ،
فرض کرو ہم جو کچھ اب ہیں وہ ناں ہوتے — !

۱۹۷۷ء

رات

جاگتی آنکھ کا ہر بھید پتہ ہے اُس کو
یہ الگ بات کہ کچھ مُنہ سے نہیں بولتی رات

شہرِ در بند سے ٹکرا کے فنا ہو جاتے
ہم پہ یہ ریشمی باہیں نہ اگر کھولتی رات

۱۹۷۷ء

چور دروازہ

بھیگتی شب ہے فلک پر ہیں ستارے ہر سُو
شاید اس وقت مرے ساتھ ہزاروں آنکھیں
اِن کا ضو بار سفر دیکھتی ہوں !
سوچتی ہوں !
"کون تارا ہے کہاں !
چاند سے کتنا قریب !
کہکشاں زاد کہ تنہا تنہا "

پھر اچانک جو کوئی

اَبر کا سایہ سا تاروں کی گزرگاہ میں لہراتا ہے

دِل بولتا ہے

دِل بہت دھیرے سے کانوں میں مِرے بولتا ہے

"یہ تو سب ایک سے تارے ہیں تمھیں

یہ بھی معلوم نہیں

جو ابھی ٹوٹ کے بکھرا ہے، کہاں تھا، کیا تھا!"

کس کو معلوم، ستارے بھی ہمیں دیکھتے ہوں!

۱۹۷۷ء

چُن لو اپنے اپنے خواب

چُن لو اپنے اپنے خواب

اب ڈھیر لگا ہے خوابوں کا
مہتابوں اور گلابوں کا
ہر آنکھ طلب سے بوجھل ہے
ہر خواب کسی کی منزل ہے
ہر خواب تمنّاؤں کا باب
چُن لو اپنے اپنے خواب

یہ شام سمے کا دھندا ہے

اس وقت یہاں پر مندا ہے

ایمان کی قیمت دو آنے

احسان کی قیمت دو آنے

توقیر ملے گی دو آنے

تشہیر ملے گی دو آنے

ہر خوب کی قیمت دو آنے

ہر خواب کی قیمت دو آنے

دو آنے بھئی دو آنے

دو آنے بھئی دو آنے

۱۹۷۷ء

ایک سوال

قریہ قریہ پُوچھ رہی ہے خلقت ایک سوال !
کب ٹوٹے گا سر سے ہمارے لوہے کا یہ جال

لوہے کا یہ جال کہ جس میں
تیس برس سے قید ہیں اپنے سارے خواب خیال
بنجر ماہ و سال

بنجر ماہ و سال کہ جن کے
چہرے ہرے کچُور ہیں لیکن آنکھیں لالو لال
آنکھیں لالو لال کہ جن میں

ہَولے ہَولے تیر رہے ہیں پھیکے زرد ملال
قریہ قریہ پُوچھ رہی ہے خلقت ایک سوال
کب تک اِس مٹی کے بیٹے ہوں گے یوں بے حال!
کب تک ہم کو بننا ہوگا ـــــ نیلامی کا مال۔!!

۱۹۷۷ء

شطرنج

وہ بادشاہ ہو، گھوڑا ہو، فیل ہو کہ وزیر
بساطِ دہر پہ بکھرے ہُوئے سبھی مُہرے،
جو کوئی غور سے دیکھے تو صرف پیادے ہیں
شکست و فتح کے جھگڑوں سے بے خبر، چُپ چاپ
صلیبِ وقت پہ لٹکے ہُوئے ارادے ہیں

۱۹۷۷ء

کبھی کبھی .....

کبھی کبھی اِن حبس بھری راتوں میں
جب
سب آوازیں سو جاتی ہیں
آدھی نیند کی گھائل سی مدہوشی میں
اِک خواب انوکھا جاگتا ہے!
میں دیکھتا ہُوں
گرُد کی اس چادر سے اُدھر
(جو میرے اُس کے بیچ تنی ہے)
وہ بھی تنہا جاگ رہا ہے۔

۱۹۷۷ء

میرے گھر میں روشن رکھنا یہ معصوم ہنسی

چینی کی گڑیا سی جب وہ
چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی
میری جانب آتی ہے، تو
اُس کے لبوں پر ایک سِتارا کھِلتا ہے
"پاپا"
اللہ — اِس آواز میں کتنی راحت ہے
ننّھے ننّھے ہاتھ بڑھا کر
جب وہ مجھ کو چھوتی ہے تو یوں لگتا ہے
جیسے میری رُوح کی ساری سچّائی
اُس کے لمس میں جاگ اُٹھی ہے —

اے مالک ، اے ارض و سما کو چٹکی میں بھر لینے والے
تیرے سب معمور خزانے
میری ایک طلب !
میرا سب کچھ مجھ سے لے لے
لیکن جب تک
اس آکاش پہ تارے جلتے بجھتے ہیں
میرے گھر میں روشن رکھنا یہ معصوم ہنسی ،
اے دنیا کے ربّ !
کوئی نہیں ہے اس لمحے میں تیرے میرے پاس
سچ سچ مجھ سے کہہ
تیرے ان معمور خزانوں کی بے انت گرہ میں
بچّے کی معصوم ہنسی سے زیادہ پیاری شے
کیا کوئی ہے ؟

۱۹۷۷ء

نئے سال کی پہلی نظم

چلو کچھ آج حسابِ زیانِ جاں کر لیں!
اَلم شمار کریں ___ درد آشکار کریں
گلے جو دل کی تہوں میں ہیں آبلوں کی طرح
انھیں بھی آج شناسائے نوکِ خار کریں

جو بے وفا ہو اُسے بے وفا کہیں کھُل کر
حدیثِ چشم و لبِ سوختہ کہیں کھُل کر
کہاں تلک یہ تکلّم زمانہ سازی کے
پسِ کلام ہے جو کچھ ذرا کہیں کھُل کر

خُنک خُنک سی ہنسی ہنس کے مِل رہے ہو کیوں!
لہو ہے سرد تو آنکھیں بھی مُنجمد کر لو
جو دل میں دفن ہے، چہروں پہ اشتہار کریں
اَلم شمار کریں ـــــ درد آشکار کریں

تُمھارا میرا تعلّق بس ایک لفظ کا ہے
لُغت کے اَنت میں سِمٹا ہُوا فقط اِک لفظ
اس ایک لفظ میں سچّائی ہے زمانوں کی
چلو کہ آج یہی لفظ اختیار کریں
تمام عُمر پڑی ہے منافقت کے لیے
اِس ایک لفظ کا دامن نہ داغدار کریں
اَلم شُمار کریں ـــــ درد آشکار کریں
چلو کچھ آج حسابِ زیانِ جاں کرلیں!

۱۹۷۶ء

زمستاں مرے جسم میں موجزن ہے

کوئی بات کہہ کے ،

میں جب اپنی سانسوں کو کہرے میں لپٹی ہوئی

شاہراہوں پہ چلتے ہوئے دیکھتا ہوں ،

تو بے روئے آنسو کا جالا سا چاروں طرف پھیلتا ہے

اور آگے کی چیزیں ہیولوں کی مانند بنتی بگڑتی ہیں

تب لوگ کہتے ہیں

"یہ رُت زمستاں کے کھلنے کی ہے"

اور میں سوچتا ہوں

"زمستاں کہاں ہے

دُھواں بنتی سانسوں میں !

آنسو۔ کے جالے میں !
یا ان ہیولوں کے بننے بگڑنے میں یا . . . .''

اگر یہ حقیقت میں فصلِ زمستاں ہے تو کس سے پُوچھوں
کہ جو اِتنے موسم گئے اور آئے
سبھی کی شباہت زمستاں سی کیوں تھی ؟

(۲)

کئی سال گزُرے
انھی شاہراہوں پہ چلتے ہُوئے ، ہم کوئی بات کہہ کے
دُھواں بنتی سانسوں میں اپنے ہی الفاظ کو دیکھتے تھے ۔
نجانے میں اُس وقت کیا کہہ رہا تھا !
کہ تم تھے جو کچُھ کہتے کہتے اچانک رُکے تھے !
کہ پھر یہ زمستاں تھا جس نے کوئی اَن کہی بات کاٹی تھی !
کچھ ٹھیک سے یاد آتا نہیں ___ !

صرف اِتنا پتہ ہے

کہ اس دن سے آنکھوں میں آنسو کے جالے ہیں

آگے کی چیزیں ہیولوں کی مانند بنتی، بگڑتی ہیں . . . .

بنتی بگڑتی ہیں . . . . بنتی بگڑتی چلی جا رہی ہیں

(۳)

زمستاں جُدائی کے موسم کا اِک آئنہ ہے

اور اس آئنے میں

تمھیں جس گھڑی میں مُسافت کی پھیلی ہُوئی دُھند میں دیکھتا ہُوں

مُجھے ایسا لگتا ہے

جیسے ہر اِک شے اِسی ایک لمحے سے پیدا ہُوئی ہے ،

ہر اک رُت اسی خواب کا عکس ہے' سارے موسم مرے

جسم میں موجزن ہیں

لہو کے سمندر کی اَمواج ہیں — !

زمیں ، آسماں ، پھُول ، تارے ، ہوائیں ، سمندر ، جزیرے ، پہاڑ

اور ندیاں

تُھارے ہی چہرے کے بُھولے ہُوئے نقش ہیں اور موسم ،

اَزل سے ابد تک کا ہر ایک موسم ،

جُدائی کے موسم کی تجرید ہے —

(۴)

زمستاں مِرے ہست کا اِستعارہ ہے ، وہ آئنہ ہے

جو کھوئے ہُوئے عکس کا ترجماں ہے

جُدائی کے لمحے سے کچُھ دیر پہلے جو تم مُسکرائے تھے

اس کا گماں ہے

کوئی بات کہہ کے

میں جب اپنی سانسوں کو کُہرے میں لپٹی ہُوئی شاہراہوں

پہ چلتے ہُوئے دیکھتا ہوں تو بے روئے آنسو کا جالا سا چاروں

طرف پھیلتا ہے اور آگے کی چیزیں ہیولوں کی مانند بنتی بگڑتی ہیں

مَیں سوچتا ہُوں — زمستاں کہاں ہے !

۱۹۷۶ء

فرزندِ چین کے نام، ایک نظم

مَوت وہ محور ہے جس پر

اس زمیں کا سَرد گولا گھُومتا ہے

اس جہانِ آب و گِل کا زرد گولہ

جس میں اُونچے اُونچے پربت، سبز پیکر وادیاں

بے جہت صحرا، سمندر، ساحلوں کی بستیاں

خاک کے پردے میں پستی بے ٹھکانہ ہڈیاں

جاگتے، سوئے ہُوئے آتش فشاں

وقت کے اِک بے نشاں دھارے میں ہیں

کارواں در کارواں!

پیہم رواں!

اِس غبارِ رائیگاں میں آدمی کی زندگی
خاک کے ذرّے کی اِک تمثال ہے
خاک کا ذرّہ ــــ جو کم قیمت ہے
بے مایہ ہے، جنسِ رائیگاں ہے
اپنے ہونے اور نہ ہونے کا گُماں ہے!

اَن گنت کیڑوں مکوڑوں کی طرح
ہر گھڑی، ہر پَل فنا ہوتی ہُوئی مخلوق کے انبوہ میں
جب میں اس دشتِ فنا کو دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں
ابنِ آدم خاک کا اِک ذرّہ کم تر سہی
پر اسی سے اس جہانِ آب و گِل کی زندگی ہے
اِک کرن ہے
جو اَزل کی صُبح سے گرمِ سفر ہے
پر ابد تک اس کی لَو سے روشنی ہی روشنی ہے

جب کوئی آدم کا بیٹا
چین کے اس بطلِ حرّیت سا بیٹا
اس جہانِ آب و گِل سے روشنی کی لہر بن کر پھُوٹتا ہے
ٹوٹتا ہے!

خالقِ کون و مکاں،
آسماں کے تخت سے نیچے اُتر کر
اپنے آدم کی جبیں کو چُومتا ہے۔

۱۹۷۶ء

محمدؐ علی جناح کے لیے ایک نظم

آدم کی تاریخ کے سینے میں ڈُوبے ہیں
کتنے سُورج، کتنے چاند!
کیسے کیسے رنگ تھے جو مٹّی سے پُھوٹے
موجِ ہَوا کے بنتے اور بگڑتے رستوں میں بِکھرے
اور خاک ہُوئے
نیلے اور اتھاہ سمندر کے ہونٹوں کی پیاس بنے
آنے والے دن کی آنکھوں میں لہراتی آس بنے
کیسے کیسے رنگ تھے جو مٹّی سے چمکے
اور چمک کر پڑ گئے ماند!

کُچھ سُورج ہیں ایسے پھر بھی

اپنی اپنی شام میں جو اِس دشتِ اُفق کا رزق ہُوے پر

روشن ہیں، گہنائے نہیں

پُھول ہیں جن کو چُھونے والی سبز ہَوائیں خاک ہُوئیں

لیکن اب تک تازہ ہیں، کمھلائے نہیں

ایسا ہی اِک سُورج تھا وہ آدم زادہ

ٹوٹی اینٹوں کے ملبے سے

ایک عمارت کی بنیادیں ڈال رہا تھا

سات سمندر جیسے دل میں

اُن کے غم کو پال رہا تھا

جن کے کالے تنگ گھروں میں کوئی سُورج چاند نہیں تھا

پُھولوں کی مہکار نہیں تھی بادل کا امکان نہیں تھا

صُبح کا نام نشان نہیں تھا

نیند بھری آنکھوں کے رَن میں

وہ خُود سُورج بن کر اُبھرا

ڈھلتی شب میں پُورے چاند کی صُورت نِکلا
صُبح کے پہلے دروازے پر دستک بن کر گُونج اُٹھا۔

آج میں جس منزل پہ کھڑا ہُوں
اس پر پیچھے مُڑ کر دیکھوں
تو اِک روشن موڑ پہ اَب بھی
وہ ہاتھوں میں
آنے والے دن کی جلتی مشعل تھامے
میری جانب دیکھ رہا ہے
جانے وہ کیا سوچ رہا ہے!

۱۹۷۶ء

لفظِ پسِ لفظ

کِس قدر لفظ ہیں

جو ہم بولتے ہیں ، رُو لیتے ہیں

کون سا لفظ ہے کھولے گا جو درِ معنی کا ،

اِس کا پتہ کون کرے !

تم تو خُوشبو ہو، ستاروں کی گزرگاہ ہو تم !

تُم کہاں آؤ گے اس دشتِ پُراسرار کی پہنائی میں !

کیسے اُترو گے تمنّاؤں کی گہرائی میں!

رہ گیا مَیں ___ !

سوئے جانِ وفا
میں تو جو کچھ ہُوں تمھارے ہی خمِ چشم سے ہوں
تم ہی جب لفظِ پسِ لفظ سے آگاہ نہیں
کِس طرح سحرِ مفاہیم کا دروازہ کھُلے !
لفظ کی کوکھ میں تاثیر کہاں سے اُترے
تم مرے ساتھ ہو ، ہمراہ نہیں !
کون سے خواب کے جگمگ میں نہاں ہیں ہم تم !
کیسے گردابِ تمنّا میں رواں ہیں ہم تم !
لفظ کے پار جو دیکھیں تو کوئی راہ نہیں
اور تم لفظِ پسِ لفظ سے آگاہ نہیں ۔

۱۹۷۶ء

عجیب رَو ہے خیال کی بھی

ابھی ہیں دُنیا کے نیم گولے کی بے کرانی میں ابنِ آدم
کی ناتوانی کی، کامرانی کی داستاں میں بھٹک رہا تھا
ابھی کسی اجنبی شناسا کا ایک جُملہ
سماعتوں کے گھنے شجر میں
فراق کوئل کی کُوک بن کر چمک اُٹھا ہے!

عجیب رَو ہے ملال کی بھی

۱۹۷۶ء

نظم

وقت سے کون کہے ، یار ، ذرا آہستہ

گر نہیں وصل تو یہ خواب رفاقت ہی ذرا دیر رہے ،

وقفۂ خواب کے پابند ہیں

جب تک ہم ہیں !!

یہ جو ٹوٹا تو بکھر جائیں سارے منظر

(تیرگی زاد کو سُورج ہے فنا کی تعلیم)

ہست اور نیست کے مابین اگر

خواب کا پُل نہ رہے

کچھ نہ رہے

وقت سے کون کہے،

یار، ذرا آہستہ!

۱۹۷۶ء

دو مُختصر نظمیں

تلازمہ

خواب آئینہ صفت
آئنے، سیماب صفت
اور سیماب اُبھرتے ہُوئے مہتاب صفت
عکس در عکس بھی ہیں، عکس سے محروم بھی ہیں
اور دیکھو تو یہی زیست کا مفہوم بھی ہیں

۱۹۷۵ء

چاند کی موت

اپنا رُوپ دیکھ کر ٹھہر گیا
اس کے بعد جھیل میں اُتر گیا

طلسمِ سفر

گزر گئی ہیں جو راتیں اُنھیں گزرنا تھا ــــ
اگر ہے فرق وصال و فراق میں ــ کیا ہے !
خبر تمھیں بھی نہیں ہے مجھے بھی علم نہیں
مگر یہ کیسی کسک ہے ؟
ہَوا کا رنگ درختوں پہ حرف لکھتا ہے
سکوں کے حرف کہ جیسے سفر تمام ہُوا
مثالِ مَوجِ شکستہ، فرازِ ساحل پر
کچُھ ایسے تھک کے گرے ہیں کہ جیسے جَزر کا ہاتھ
کرے گا اَب نہ تلاطم سے آشنا ہم کو ۔
مگر یہ کیسی چمک ہے ؟
بِکھرتے جھاگ کی اُنگلی سے ریگِ ساحل پر
بھنور کی آنکھ کے منظر دکھا رہی ہے مجُھے ۔

طلوعِ صُبحِ اَزل سے غروبِ محشر تک
ہر ایک چیز طلسمِ سفر کی قیدی ہے
کہیں نہیں ہے ٹھکانہ ہوائے صحرا کا،
یہ جس پڑاؤ کو منزل سمجھ رہے ہیں ہم
اِسے بھی ریگِ رَواں کی مثال ہونا ہے
یہ ایک لمحۂ پرّاں بھی تتلیوں کی طرح
ہتھیلیوں پہ فقط رنگ چھوڑ جائے گا
ترے جمال کے، میرے فشارِ شوق کے رنگ
گلوئے اہلِ محبّت، نشانِ طوق کے رنگ
ہر ایک خواب کا جادُو ہے آنکھ کھُلنے تک!
ہزار پا ہے جو خواہش گریز پا ہوگی
تو کیوں نہ ہم اسی جادُو کو جاوداں کریں!
ہتھیلیوں میں چھپا کر بھٹکتے رنگوں کو
اِسی وصال کے لمحے کو بیکراں کریں!

۱۹۷۵ء

سالگرہ

برتھ ڈے کیک پہ جلتی ہُوئی شمعوں کے بُجھا دینے سے
کب بُجھیں گے یہ شب و روز و مہ و سال کے انگار، جنھیں
چُھو نہ سکا
وقت کا سیلِ رواں
وقت کا سیلِ رواں جس کے خم و پیچ میں گُم
ہم اور تُم
ہم اور تُم سے ہزاروں لاکھوں
گُم سُم

آج کی رات ،

میں نے ہر سال اسی طور سے کاٹی ہے کہ جیسے کوئی

قید خانے میں کرے عہدِ اسیری کا حساب

کرچیاں ہوتے ہُوئے خواب چُننے اور سُنے

دشتِ احساس میں آہٹ کے سراب

کون ، کب ، کون سی منزل پہ مِلا

کِس طرح بچھڑا ، کہاں پر بچھڑا

دوست کس طور بنے دشمنِ جاں

غیر کِس طرح ہُوئے سانس کی خُوشبُو جیسے

کِس کو فرُصت ہے کرے ، ان کا حساب

اور اگر ہو بھی تو اس کام میں رکھا کیا ہے

آخر کار وہی سیلِ رواں ہو گا جواب !

وقت کا سیلِ رواں

جس کے اُس پار کہیں رکھی ہے !

گمشدہ عمر کے لمحوں کی کتاب

اور اِس پار فقط ــــ خواب ہی خواب

جو بھی رُت آئے کھِلا کرتے ہیں

تیری یادوں کے کنول، تیری جُدائی کے گلاب!

۱۹۷۵ء

ناگزیر

یہ رات اپنے سیاہ پنجوں کو جس قدر بھی دراز کر لے
میں تیرگی کا غبار بن کر نہیں جیوں گا

مجُھے پتہ ہے کہ ایک جگنو کے جاگنے سے
یہ تیرگی کی دبیز چادر نہیں کٹے گی
مجُھے خبر ہے کہ میری بے زور ٹکّروں سے
فصیلِ دہشت نہیں ہٹے گی
میں جانتا ہوں کہ میرا شعلہ چمک کے رزقِ غبار ہو گا
تو بے خبر یہ دیار ہو گا

میں روشنی کی لکیر بن کر کسی ستارے کی مثل بکھروں گا

بستیوں کو خبر نہ ہوگی

میں جانتا ہوں کہ میری کم تاب روشنی سے سحر نہ ہوگی

مگر میں پھر بھی سیاہ شب کا غبار بن کر نہیں جیوں گا

کرن ہو کتنی نحیف لیکن کرن ہے پھر بھی،

وہ ترجماں ہے کہ روشنی کا وجود زندہ ہے

اور جب تک

یہ روشنی کا وجود زندہ ہے رات اپنے

سیاہ پنجوں کو جس قدر بھی دراز کر لے،

کہیں سے سورج نکل پڑے گا ــــــ

۱۹۷۵ء

ایک اور سفر

کب تک آنکھیں بھینچ کے بیٹھوں
پاگل اور مُونہہ زور ہَوا کے رستے میں — !

چاروں جانب
گئے ہُوؤں کے نقشِ کفِ پا — نقشِ فنا ہیں
گرد باد کے خیمے دل کے صحراؤں میں اُترے ہیں
آوازوں کا
گئے ہُوؤں کی آوازوں کا

درد الاؤ بجھنے کو ہے،
حدِ نظر تک — اُفق اُفق پر — روشنیوں کا نام نہیں ہے
تاریکی میں کس کو خبر ہے کون کہاں رہ جائے !

آؤ ،

اِس سے پہلے ، آخری شعلہ بھی مر جائے

آؤ ،

اِک دُوجے میں اپنے اپنے چہرے دیکھیں اور پہچانیں

یہ پہچان کا شعلہ ہی اب رختِ سفر ہے

شب کے کالے صحراؤں میں کِس کو خبر ہے ،

صُبح کدھر ہے —!!

گئے ہُوؤں کی آوازوں کا دَرد الاؤ بُجھنے کو ہے

اس سے پہلے آخری شعلہ بھی مر جائے ،

آؤ چلیں —!

۱۹۷۵ء

احمد ندیم قاسمی

میں نے اُس شخص کی آنکھوں میں فروزاں دیکھی
اُس کے نکھرے ہُوئے باطن کی چمک
اُس کی تحریر کی خوشبُو میں گُل افشاں دیکھی
اُس کے مہکے ہُوئے لہجے کی کھنک
اُس کے کردار کے پردے میں نمایاں دیکھی
عظمتِ آدمِ خاکی کی جھلک

اُس نے بتلایا مجھے ،
کیسے فن کار کا فن،
اُس کے احساس کی قوّت سے جنم لیتا ہے
اُس نے سِکھلایا مجھُے
کِس طرح کوئی زمانے کو مَسرّت دے کر
اپنے حِصّے میں اَلم لیتا ہے
آسماں ، کون سے لوگوں کے قدم لیتا ہے!

۱۹۷۴ء

طلسمِ خاک

ہم کہ اس خاک سے تخلیق ہُوئے
خاک کا رِزق بنیں گے اِک دِن
خاک کا رُوپ ہیں ہم، خاک ہمارا درشن
جو بھی اس کارگہِ ہست میں "موجود" نظر آتا ہے
خاک کا وہم ہے، مٹّی کا گماں ہے، آنکھیں
خواب میں دیکھے ہُوئے خواب کی تصویریں ہیں
ایک ہی عکس ہے جن میں حاضر
خاک کے جوہرِ بے نام کا عکس

ایک جانے ہُوئے گمُنام کا عکس

آئنہ خاک کا ٹوٹے تو رہا ہوں ہم تمُ !
اپنے سایوں سے جُدا ہوں ہم تم !

تُم مِلے بھی تو مجُھے خاک کے جادے میں ملے ،
جادۂ خاک کہ جس کا نہ اَزل ہے نہ اَبد
تم مجھے میرے ہی کمزور ارادے میں ملے
خاک ہے جس کی سند !
اس نمائش گہہِ ہستی کے سَفر سے ہم تم
دُوریاں پہنے ہُوئے یُونہی گزُر جائیں گے
زادۂ خاک ہیں ، چُپ چاپ بِکھر جائیں گے
ہم کہ اِس خاک سے تخلیق ہُوئے ___

۱۹۷۴ء

عکس کا خوف

کُتّے بھونکتے ہیں

راتوں کو جب کہیں اچانک کُتّے بھونکتے ہیں

تو میرا دل اِک ایسے خوف سے بھر جاتا ہے

جس کا کوئی نام نہیں ۔

ان کی کالی آوازوں سے

میرے اندر سونے والا اِک کُتّا بھی جاگ اُٹھتا ہے

لالچ ، وہم اور خوف کا کُتّا ۔

باہر بھونکنے والے کُتّے تھک جاتے ہیں ـــ

پر یہ اندر بھونکنے والا کُتّا جاگتا رہتا ہے ـــ

۱۹۷۴ء

محبّت کی ایک نظم

اگر کبھی میری یاد آئے

تو چاند راتوں کی نرم دل گیر روشنی میں

کسی ستارے کو دیکھ لینا۔

اگر وہ نخلِ فلک سے اُڑ کر تمھارے قدموں میں آ گرے تو

یہ جان لینا، وہ استعارہ تھا میرے دل کا،

اگر نہ آئے . . . .

مگر یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ تم کسی پر نگاہ ڈالو

تو اُس کی دیوارِ جاں نہ ٹُوٹے

وہ اپنی ہستی نہ بُھول جائے!

اگر کبھی میری یاد آئے

گریز کرتی ہوا کی لہروں پہ ہاتھ رکھنا
میں خوشبوؤں میں تمھیں ملوں گا۔
مجھے گلابوں کی پتّیوں میں تلاش کرنا
مَیں اوس قطروں کے آئنوں میں تمھیں ملوں گا۔
اگر ستاروں میں، اوس قطروں میں، خوشبوؤں میں، نہ پاؤ مجھ کو
تو اپنے قدموں میں دیکھ لینا
میں گرد ہوتی مسافتوں میں تمھیں ملوں گا۔
کہیں پہ روشن چراغ دیکھو تو جان لینا
کہ ہر پتنگے کے ساتھ میں بھی بکھر چکا ہوں
تم اپنے ہاتھوں سے ان پتنگوں کی خاک دریا میں ڈال دینا
میں خاک بن کر سمندروں میں سفر کروں گا۔
کسی نہ دیکھے ہوئے جزیرے پہ رُک کے تم کو صدائیں دوں گا
سمندروں کے سفر پہ نکلو تو اُس جزیرے پہ بھی اُترنا۔

۱۹۷۴ء

جال

جب مرے پاس تھے تُم
میں نے کئی بار یہ سوچا، تُم سے
آنکھ میں بکھرے ہُوئے خواب کا احوال کہوں
کیسے کٹتے ہیں مرے روز و مہ و سال کہوں
فیصلے اور عمل میں لیکن
ایک دیوار جو صدیوں سے کھڑی ہے، میں بھی
اُس میں روزن ہی بنانے کی تگ و دَو میں رہا
سعیِ بیکارِ تمنّا کی قلمرو میں رہا

اب جو تم بچھڑے ہو تو

دن رات مرے دل میں عجب وہم سا رہتا ہے

کہ جیسے میں نے ،

یُونہی اِک خوف کو دیوار بنا رکھا تھا

دِل کو اِک نقطۂ پرکار بنا رکھا تھا ۔

سوچتا ہوں کہ اگر میں نے کبھی

تم کو اُس خواب کا احوال سُنایا ہوتا ، تو بھلا کیا ہوتا !

حد سے حد تم مری باتوں سے خفا ہو جاتے

اِک تمسخر کی ہنسی ہنس کے جُدا ہو جاتے ۔!!

۱۹۷۴ء

جو بھی کچھ ہے محبّت کا پھیلاؤ ہے

جو بھی کچھ ہے محبّت کا پھیلاؤ ہے
تیرے میرے اَبد کا کِنارا ہے یہ
اِستعارہ ہے یہ
رُوپ کا داؤ ہے
پیار کا گھاؤ ہے
جو بھی کچھ ہے محبّت کا پھیلاؤ ہے

صُبح دم جب گھڑی ، پھُول کی پنکھڑی
اوس کا آئینہ جگمگانے لگا ،
ایک بھنورا وہیں ، دیکھ کر ہر کہیں
شاخ کی اوٹ سے سر اُٹھانے لگا
پھُول ، بھنورا ، تلاطم ہے ، ٹھہراؤ ہے
جو بھی کچھ ہے محبّت کا پھیلاؤ ہے

خواب کیا کیا چُنے ، جال کیا کیا بُنے
موج تھمتی نہیں ، رنگ رُکتے نہیں
وقت کے فرش پر ، خاک کے رقص پر
نقش جمتے نہیں ، اَبر جھُکتے نہیں
ہر مُسافت کی دُوری کا سمٹاؤ ہے
جو بھی کچھ ہے محبّت کا پھیلاؤ ہے

سَواگت

مِلن کا سُورج چمک رہا ہے !

دلوں کی صُورت وطن کی مٹّی کا ذرّہ ذرّہ دھڑک رہا ہے !

مِلن کا سُورج چمک رہا ہے !

ملاپ ساعت کا نیک قاصد خبر دریچوں سے ہو کے گزُرا

تو آرزو سے بھری نگاہوں نے اُس کے قدموں میں گُل بچھائے

گئی رُتوں کی دبیز چلمن سے مُسکرائے

ضعیف آنکھوں کے نُور، ہاتھوں سے دُور، تارے

وہ جان پارے!

وہ پھُول (جن پر گئے ہوؤں کی خیال شبنم لرز رہی تھی)

بہار قدموں کی چاند آہٹ سے کھل اُٹھے ہیں

وہ خواب (جن پر مفارقت کی سیاہ چادر لٹک رہی تھی)

حقیقتوں میں بدل گئے ہیں

پلک جھپکنے میں غم کے بادل ہَوا ہُوئے ہیں

عجیب دَروازے وا ہوئے ہیں!

غنیم سرحد سے آنے والوں کو ہو مبارک

کہ حوصلوں کے اس امتحاں میں وہ سُرخرو ہیں

انھیں مبارک کہ اُن کے پاؤں وطن کی مٹّی کو چھُو رہے ہیں

وطن کی مٹّی جو اپنی ہستی کا مدّعا ہے

جو ابتدا ہے۔ جو انتہا ہے!

اُنھیں مبارک کہ اُن کے عزم و وفا کا شعلہ

ہر ایک گھر میں بھڑک رہا ہے

دِلوں کی صُورت

وطن کی مٹّی کا ذرّہ ذرّہ دھڑک رہا ہے

مِلن کا سُورج چمک رہا ہے

۱۹۷۳ء

بستیاں راکھ ہُوئی ہیں لیکن...

اِن زمینوں کی ہَوا تُند ہے ، بچ کر چلنا
خُون کا نشّہ ، نگاہوں میں اُتر آیا ہے
ہر حقیقت کا گُماں
خوف اور طیش کی راہوں میں اُتر آیا ہے

موت پھر موت ہے ، جب گھر سے نکل آتی ہے
آہٹیں بَین کا آہنگ لیے چلتی ہیں
خواہشیں اپنا لہو ، سنگ لیے چلتی ہیں

موت کی سرد ہَوا

شہرِ پُرشور کو بے صوت بنا دیتی ہے

آنے والوں کے سواگت میں فروزاں چہروں ،

کھڑکیوں اور دریچوں میں بھٹکتی آنکھوں ،

گرم سینوں میں تمنّا کے دہکتے شعلوں ،

اور بے نام چراغوں کو بُجھا دیتی ہے

راستے اندھے فقیروں کی طرح

کسی رہگیر کی آہٹ پہ لگے رہتے ہیں

اور ویران مکانوں کے درو بام سے ٹکرا کے ہَوا

جانے والوں کو صدا دیتی ہے

بستیاں راکھ ہُوئی ہیں لیکن

کِس پہ الزام دھریں

جلنے والوں میں ہی شامل ہیں جلانے والے

مرنے والے ہی جہاں مارنے والے ہوں ، وہاں

کون بتلائے کہاں ظُلم ہُوا، کس پہ ہُوا، کس نے کیا؟
تیغ بَر دوش ہیں سب زخم دکھانے والے!
سُرخیٔ خوں سے مبّرا کوئی دامان نہیں
اب یہاں ظالم و مظلوم کی پہچان نہیں

۱۹۷۱ء

دو مُختصر نظمیں

مُشکل :

حصُولِ لذّت گُنہ نہیں ہے
مگر وہ رستے
جو لذّتوں کی طرف گئے ہیں
اَزل سے لے کر ابد کی بے نام وسعتوں تک
گُنہ کی منزل سے پھُوٹتے ہیں

۱۹۶۸ء

روایت :

"نہیں" اور "ہے" کے اندھیرے سفر میں
ازل سے مسلسل چلا جا رہا ہُوں
مگر آگے پیچھے وہی راستے ہیں
کئی بار جن سے گزُر کر گیا ہُوں
میں جیسے کسی دائرے میں گِھرا ہوں!

۱۹۶۸ء

سرمایۂ جاں

یہ سب نے دیکھا
کہ سازِ گل سے نکل کے خوشبو کا ایک جھونکا
ہزار نغمے سُنا گیا ہے
مگر کسی کو نظر نہ آیا کہ اِس کے پردے میں گُل نے اپنا
تمام جوہر لُٹا دیا ہے

یہ میری سوچوں کی سبز خُوشبو
یہ میری نظمیں یہ میرا جوہر

یہ میرے لفظوں کے شاہزادے
یہ میری آواز کے مُسافر
نکل کے ہونٹوں کی وادیوں سے
خموشیوں کے مہیب جنگل میں آہٹوں کے فریب کھاتے
نشاطِ منزل کی جستجو میں

اُداس رستوں پہ چل رہے ہیں
سَفر کے دوزخ میں جل رہے ہیں

۲۶
۲
۶۷

بازگشت

ایسی ہی سرد شام تھی وہ بھی،
جب وہ مہندی رچائے ہاتھوں میں
سُرخ آنچل میں مُنہ چھپائے ہُوئے
اپنے خط مجُھ سے لینے آئی تھی۔

اُس کی سہمی ہُوئی نگاہوں میں کتنی خاموش التجائیں تھیں!
اُس کے چہرے کی زرد رنگت میں کتنی مجبوریوں کے سائے تھے!
میرے ہاتھوں سے خط پکڑتے ہی
جانے کیا سوچ کر اچانک وہ
میرا شانہ پکڑ کے روئی تھی

اُس کے یاقوت رنگ ہونٹوں کے، کپکپاتے ہُوئے کناروں پر
ثبت بیتے ہُوئے زمانے تھے ،
سینکڑوں ان کہے فسانے تھے ،

سَرد شاموں میں آج بھی اکثر
اُس کی رُخصت کا بے صدا منظر، میری آنکھوں میں جِھلملاتا ہے
ایک لمحہ حنائی ہاتھوں سے مجھ کو اپنی طرف بُلاتا ہے ،

ایسی ہی سَرد شام تھی وہ بھی ۔

۱۹
۵
۶۴

فاصلے

اب وہ آنکھوں کے شگوفے ہیں نہ چہروں کے گلاب
ایک منحوس اُداسی ہے کہ ٹلتی ہی نہیں
اِتنی بے رنگ، ہیں اب رنگ کی خوگر آنکھیں
جیسے اُس شہرِ تمنّا سے کوئی ربط نہ تھا
جیسے دیکھا تھا سراب۔

دیکھ لیتا ہُوں اگر کوئی شناسا چہرہ
ایک لمحے کو اُسے دیکھ کے رُک جاتا ہُوں
سوچتا ہوں کہ بڑھوں اور کوئی بات کروں
اُس سے تجدیدِ مُلاقات کروں

لیکن اُس شخص کی مانوس گریزاں نظریں
مجُھ کو احساس دلاتی ہیں کہ اب اُس کے لیے
میں بھی انجان ہوں، اِک عام تماشائی ہوں
راہ چلتے ہُوئے اِن دُوسرے لوگوں کی طرح۔

۳
۸
۶۷

منزلِ منزل

(ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے نام)

ہمارے جسموں کے سرد خانے اَزل کے شعلے میں جل رہے ہیں
ہم اپنے پاؤں
ہُوا کی بے رنگ سیڑھیوں پر
کچھ اِس طرح سے سنبھل سنبھل کر جما رہے ہیں
کہ جیسے پھسلے
تو اس بلندی سے ایسی پستی میں جا گریں گے
جہاں اندھیرے سیاہ غاروں سے کوئی رستہ نہ مِل سکے گا
جہاں تمنّا کے خشک ہونٹوں پہ کوئی غنچہ نہ کِھل سکے گا۔
ہُوا کے زینوں کو ہم نے اپنا رفیقِ منزل بنا لیا ہے
فنا کے رستے کو پا لیا ہے
ہم آرزوؤں کی تیز حِدت میں ہولے ہولے پگھل رہے ہیں

ہمارے چاروں طرف سمندر ہے اور پانی کے تُند ریلے
ہمارے جسموں کے آبگینے اُٹھا اُٹھا کے پٹک رہے ہیں
ہماری کشتی اَزل کے دریا کی ریتلی تہہ میں کھو چکی ہے
ہمارے چاروں طرف ہماری ہی خواہشوں کے بھنور پڑے ہیں
ہماری ٹانگیں عجیب رنگوں کے پتّھروں سے اُلجھ اُلجھ کر
سیاہ مٹّی میں دھنس رہی ہیں
کئی جزیرے ہماری آنکھوں کے راکھ دانوں میں جل رہے ہیں۔

کِسی نے ہنس کر بُلا لیا تو ہر ایک دھڑکن چہک اُٹھے گی
کِسی نے دامن چھُڑا لیا تو اِک آگ دل میں بھڑک اُٹھے گی
ہماری خُوشیوں کی عُمر کیا ہے!
ہمارے دُکھ کی بساط کیا ہے!
ہم اپنے ہاتھوں میں شمع لے کر ہَوا کے رَستے پہ چل رہے ہیں

ہماری آنکھوں کے سب ستارے گناہ راتوں کی تیرگی میں
جوان سینوں، گداز جسموں کے پیچ و خم میں بکھر گئے ہیں
ہمارے سانسوں میں بسنے والی تمام خوشبوئیں مر چکی ہیں

ہم اپنے ہاتھوں کو روز اپنے ہی خشک بالوں میں پھیرتے ہیں۔
ہمارے چہروں کی سُرخ رنگت میں زردیوں کے مہیب سائے
بڑے تسلسل سے بڑھ رہے ہیں
ہماری پینٹوں کی پیٹیوں کے پرانے سائز بدل رہے ہیں

ہم اپنے ماضی کے پھُول دانوں سے آرزوں کے برگ ریزے
کچھ اس توجّہ سے چُن رہے ہیں کہ جیسے اِن کو
مِلا کے رکھنے سے کوئی غنچہ چٹک اُٹھے گا
ہم اپنے بچھڑے ہُوئے عزیزوں، رفاقتوں کی
گلاب تصویریں البموں میں کچھ اس طرح سے سجا رہے ہیں
کہ جیسے اِن میں سے کوئی پیکر
اچانک اِک دن دھڑک اُٹھے گا
ہمارے خوابوں کی وادیوں میں عجیب چشمے اُبل رہے ہیں

ہمارے چاروں طرف ہزاروں تلاش راہیں پڑی ہُوئی ہیں
کہیں دریچے کھُلے ہوئے ہیں کہیں صلیبیں گڑی ہُوئی ہیں
مگر ہماری نظر کے آگے دبیز پردے لٹک رہے ہیں

ہم اپنے رستے سے بے خبر ہیں اکیلے پن میں بھٹک رہے ہیں
ہم آنے والے ہر ایک لمحے کی رہگزر میں کھڑے ہیں لیکن
ہماری ٹانگوں میں ایک لمحے کے ساتھ چلنے کا دم نہیں ہے
نئے جزیروں کی آرزو ہے کنارِ دریا مچل رہے ہیں

کھُلے دریچوں میں چلمنوں میں
ہجوم سڑکوں میں ہوٹلوں میں
ہزار چہرے ہماری آنکھوں کی خلوتوں کو سنوارتے ہیں
کِسی کے عارض، کِسی کے گیسو
ہمارے خوابوں کی وادیوں کو بہار بن کر نکھارتے ہیں
مگر ہمارے قریب آکر
ہر ایک چہرے کی خوش نمائی بدن کے لفظوں میں بولتی ہے
ہمارے خوابوں کو رولتی ہے
ہم اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھے فنا کے رستے پہ چل رہے ہیں
ہمارے جسموں کے سرد خلئے اَزل کے شعلے میں جل رہے ہیں

۲۸
۹
۶۷

ہمزاد

کچھ کیا جائے نہ سوچا جائے
مُڑ کے دیکھوں تو نہ دیکھا جائے
میری تنہائی کی وحشت سے ہراساں ہو کر
میرا سایہ میرے قدموں میں سمٹ آیا ہے
کون ہے پھر جو مِرے ساتھ چلا آتا ہے
میرا سایہ تو نہیں !!
کِس کی آہٹ کا گماں،
یوں مِرے پاؤں کی زنجیر بنا جاتا ہے
دُور تا حدِّ نظر شہر کے آثار نہیں
اور دُشمن کی طرح
شام تلوار لیے سر پہ چلی آتی ہے ،

بولتا ہوں تو اچانک کوئی
میری آواز میں آواز مِلا دیتا ہے
مجھ کو خُود میرے ہی لفظوں سے ڈرا دیتا ہے

کون ہے جس نے مِرے قلب کی دھڑکن دھڑکن
اپنے احساس کی سُولی پہ چڑھا رکھی ہے !
میری رفتار کے پُرخوف و خطر رستے میں
کِس نے آواز کی دیوار بنا رکھّی ہے !
سنگِ آواز کی دیوار گراؤں کیسے !
کچھ کیا جائے نہ سوچا جائے
مُڑ کے دیکھوں تو نہ دیکھا جائے ۔

۳
۱۲
۶۰

ناشناس

وہ چنچل البیلی لڑکی میری نظمیں یوں پڑھتی ہے
جیسے ان نظموں کا محور
اُس کی اپنی ذات نہیں ہے،
(یعنی اِتنی سُندر لڑکی اور کوئی بھی ہو سکتی ہے!)
جیسے اُس کو علم نہیں یہ ساری باتیں، اُس کی ہیں
ساری گھاتیں اُس کی ہیں
ہر آہٹ ہے اُس کی آہٹ، سب سائے ہیں اُس کے سائے
سارے مخمل اُس کے ہیں،
ہر خُوشبو ہے اُس کی خوشبو، سب چہرے ہیں اُس کے چہرے،
سارے آنچل اُس کے ہیں
جیسے اُس کو علم نہیں ہے اُس لڑکی کے سارے کام
سارے نام اُسی کے ہیں

ہر کھڑکی ہے اُس کی کھڑکی سارے بام اُسی کے ہیں
اُس لڑکی کے نام سے میں نے جو کچھ اپنے نام لکھا ہے
اُس سے ہی منسوب ہُوا ہے
(شاید میرا وہم ہو لیکن میں نے یہ محسوس کیا ہے
جب میں نظم سُناتا ہوں وہ آنکھ چُرانے لگتی ہے
مُجھ سے نظریں مل جائیں تو وہ شرمانے لگتی ہے
کچھ لمحے وہ چنچل لڑکی گُم سُم سی ہو جاتی ہے
لیکن تھوڑی دیر میں پھر سے پتّھر کی ہو جاتی ہے
جیسے میری نظم کی لڑکی —

خُود سپردگی

رات بھیگے تو پُرانے قصّے
پئے ترتیب کوئی اور سہارا ڈھونڈیں ،
چاندنی ــ نیند کا پھیلا ہُوا جادُو لے کر
دِل کے بے خواب نگر میں اُترے
اور ہَوا ــ دُھوپ سے بَولائی ہوئی سڑکوں پر
لوریاں گاتی نکلے
اوس ــ ہر پھُول کے دامن میں ستارے بھر دے

لیکن اس خواب خیالی کا نتیجہ کیا ہے !
رات کی گود مِرے درد کی منزل تو نہیں ،
دامنِ گُل پہ چمکتی شبنم
لوریاں دیتی ہُوئی سرد ہَوا

چاند کی نرم سُنہری کِرنیں
سب کے سینوں میں اُتر جائیں گی
کل کے سُورج کی جھُلستی کرنیں
ذرّہ پھر خاک بہ سر آئے گا
خواب کی آنکھ میں سمٹا ہُوا سارا کاجل
خُود اِسی خواب کے چہرے پہ بِکھر جائے گا ـــ

دِل کے قِصّوں کا مقدّر ہے پریشاں حالی
پئے ترتیب سہاروں کا تعاقب چھوڑو،
سوچ کے بخت میں اظہار کا لمحہ کب تھا؟
دلِ ناکام سرابوں کا تعاقب چھوڑو
صبح دم پھر وُہی پُتلی کا تماشا ہو گا
جاگتی رات کے خوابوں کا تعاقب چھوڑو!

———

۲۲
۲
۶۸

میں اُسے دیکھ کے حیران ہُوا پھرتا ہُوں

میں اُسے دیکھ کے حیران ہُوا پھرتا ہُوں ،
وُہی گاتی ہُوئی آنکھیں وُہی اندازِ کلام
وہی گلنار تبسم سے مہکتا چہرہ
وُہی خُوش رنگ خرام ،
نرم لہجے میں ترنم کی وہی گُل کاری
جیسے وہ کل کی گئی آج چلی آئی ہو
جیسے سب جاگ کے کاٹی ہُوئی کالی راتیں
سرد کمرے میں ٹھٹھرتی ہُوئی سوچیں، یادیں
رات بھر روئی ہُوئی آنکھ سے بھیگے تکیے
اور تالو سے چمٹے ہُوئے کڑوے لمحے ،
(میرے بہکے ہُوئے خوابوں کے تراشیدہ تھے !)
میں نے سوچا تھا گزرتے ہُوئے کڑوے لمحے
اُس کے تالُو سے بھی چمٹے ہوں گے !

اُس کے تکیوں پہ بھی میری یادیں
اشک بن بن کے ٹپکتی ہوں گی !
سرد راتوں میں سہم تنہائی
اُس کی نیندوں کو بھی کھاتا ہوگا!
اُس کی آنکھوں میں مگر دَرد کا سایہ بھی نہ تھا
(جیسے وہ گزرے ہُوئے وقت سے گزری ہی نہ تھی)
جیسے اُس نے مجھے چاہا بھی نہ تھا

مُجھ کو یوں سامنے پاکر وہ ہراساں نہ ہُوئی
میرے بے ربط سوالوں سے پریشاں نہ ہوئی
اپنے مانوس تبسم میں ترنّم بھر کر
مُجھ سے چلتے ہُوئے بولی "ہلّو
شاعرِ وقت کہو، کیسے ہو"
میں اُسے دیکھ کے حیران ہُوا پھرتا ہوں۔

۱۲
۳
۶۸

وہ ابھی اپنے چہرے میں اُترا نہیں

کس سے پُوچھوں وہ کیا
شخص ہے جو مِری
آرزو کے جھروکوں میں ٹھہرے ہُوئے
سارے چہروں میں بِکھرا ہُوا ہے مگر
خُود ابھی اپنے چہرے میں اُترا نہیں ۔

کِس سے پُوچھوں وہ کیا
نام ہے جو مِری
دھڑکنوں کے مقدّر میں مرقوم ہے
اور وہ کیا اجنبی ہے جو صدیوں سے میرے خیالوں کے قریے میں آباد ہے
مگر میرا صُورت شناسا نہیں ۔

کِس کی آواز ہے !

جو مِری رُوح میں نغمہ پرداز ہے !

کون بتلائے گا اُس نگر کا پتہ ،

جس کی مٹّی کی خُوشبو مِرے جسم کے واسطے درج ہے ،

جس کے دیوار و دَر میری بے خواب آنکھوں سے مانوس ہیں

اور جس کو کبھی میں نے دیکھا نہیں ـ

نارسائی مری ـــ نارسائی مری !

جس کو پایا نہ تھا اُس کو کھونے کا غم

میری خواہش کے سینے کا ناسُور ہے ،

کِس کو آواز دُوں ، کِس کا ماتم کروں !

وہ ابھی اپنے چہرے میں اُترا نہیں ،

کس سے پُوچھوں مِرا مدّعا کون ہے !

نارسا کون ہے !

۲۶
ــــ
۳
ــــ
۶۸

شہرِ بے مثال

ششدر ششدر، قریہ قریہ،
حیراں حیراں لوگ
سب گلیوں میں شور بپا ہے
سب گلیاں سنسان
سب آنکھیں انجان
سب شعروں اور سُروں کے پیچھے نوحوں کا احساس
پُھولوں کے قریے سے ہلا ہے رنگوں کو بن باس
سارے بام اُداس
پتّوں کی زردی سے کھائے ٹھنڈی شبنم جوش
دیوانے پتّھر کو ترسیں، فرزانے مدہوش
مستانے خاموش

رستوں کا اِک جال بچھا ہے گونگے ہیں بازار
سب ہونٹوں پر قفل پڑے ہیں آنکھوں میں زنگار
بات کرو تو کوئی نہ چونکے سب چہرے دیوار
ہر سُو رسن و دار
دُھواں دُھواں آنکھوں کے آگے

سب منظر سب حرف
ہر اک خواہش برف
چاروں جانب بول رہی ہے تنہائی کی دَف
دیواروں سے پھُوٹ رہی ہے سنّاٹے کی گُونج
دِل ہے تنہا کُونج

۱۰
۴
۶۸

آشوبِ آگہی

کوئی بتلائے مجھے
میرے اِن جاگتے خوابوں کا مقدر کیا ہے ؟
مَیں کہ ہر شے کی بقا جانتا ہوں
اُڑتے لمحوں کا پتا جانتا ہوں
سرد اور زرد ستاروں کی تگاپُو کیا ہے
رنگ کیا چیز ہے خوشبو کیا ہے ،
صبح کا سحر ہے کیا ، رات کا جادو کیا ہے ،
اور کیا چیز ہے آوازِ صبا جانتا ہوں
ریت اور نقشِ قدم ، موج کا رَم
آنکھ اور گوشۂ لَب ، زُلف کا خَم
شام اور صُبح کا غم
سب کی قسمت ہے فنا ، جانتا ہوں

پھر بھی یہ خواب مِرے ساتھ لگے رہتے ہیں
جاگتے خواب کہ جن کی کوئی تعبیر نہیں
کوئی تفسیر نہیں
صُورتِ زخم ہرے رہتے ہیں
میرے ہاتھوں سے پرے رہتے ہیں۔

آگہی جہل سے بدتر ٹھہری،
جاگتے خواب کی تعبیر مقدّر ٹھہری
زندگی میرے لیے گنبدِ بے در ٹھہری،
میں کہ آوازِ صبا جانتا ہوں
اُڑتے لمحوں کا پتا جانتا ہوں،
اور ہر شے کی بقا جانتا ہوں

۲۸
۸
۶۸

ویت نام

آگ اور آگ ہی آگ
خُون اور خُون ہی خُون
ارضِ ویتنام کے فردوس نظر خطّے میں
جتنے پتّھر تھے لہُو رنگ ہُوئے
جو فسوں خیز ہُوا
اِس مہکتی ہُوئی وادی میں چلا کرتی تھی
اس قدر گرم ہُوئی
خوشبوئیں بھاپ بنیں، سرو وسمن راکھ ہُوئے
سینکڑوں پھُول سے بچّوں کے بدن راکھ ہُوئے
خاک کی پیاس بجھے گی کب تک
یہ زمیں خُون پیئے گی کب تک!
اپنی ہی گود میں کھیلے ہُوئے جسموں کا لہُو!
اُن تڑپتی ہُوئی ماؤں کا لہُو

چھاتیاں جن کی لہو ریز ہُوئیں
دُودھ پیتے ہُوئے بچّوں کا لہو
سِسکیاں جن کی سکوں خیز ہُوئیں ،
اور پردیس میں لڑتے ہُوئے لوگوں کا لہو
جن کو اس خوُن کے بہنے کا سبب یاد نہیں ۔
سینکڑوں میل پرے
جن کی مرتی ہُوئی مائیں ہر دَم
اُن کے جینے کی دُعا مانگتی ہیں ۔
بیویاں چیختے بچّوں سے یہی کہتی ہیں
"وار آفس نے لکھا ہے ، پاپا
صرف زخمی ہے بہت جلد چلا آئے گا
ٹام اور جِم کے لیے ڈھیر سے تحفے لے کر
اور سوزی کے لیے ، خاص وتنام کا سلور نیکلس"
اور پھر رات کی کالی چُپ میں
اپنے گزُرے ہُوئے لمحوں کے لیے روتی ہیں

۲۶
۔۔
۶
۔۔
۶۸

آواز کے پتھّر

کون آئے گا !
شب بھر گرتے پتّوں کی آوازیں مُجھ سے کہتی ہیں
کون آئے گا !
کِس کی آہٹ پر مٹی کے کان لگے ہیں !
خُوشبو کِس کو ڈھونڈ رہی ہے !
شبنم کا آشوب سمجھ
اور دیکھ کہ اِن پھُولوں کی آنکھیں
کِس کا رستہ دیکھ رہی ہیں

کس کی خاطر
قریہ قریہ جاگ رہا ہے
سُونا رستہ گُونج رہا ہے
کس کی خاطر!!

تنہائی کے ہول نگر میں
شب بھر گرتے پتّوں کی آوازیں چُنتا رہتا ہوں
اپنے سر پر تیز ہَوا کے نوحے سُنتا رہتا ہوں۔

۵
۷
۶۸

دائرہ

سوچ کی ڈوریاں
رُوح کے آئینے کے لیے زنگ ہیں
ہم وہ دیوار ہیں
جس کی تعمیر میں جس قدر سنگ ہیں
سارے یک رنگ ہیں
اہلِ بینش ہمیں دیکھ کر دنگ ہیں،
سوچتے ہیں کہ یہ لوگ کیا چیز ہیں،
"سینکڑوں میل کا اجنبی فاصلہ
ان کے اِک ساتھ اُٹھتے ہُوئے پاؤں کی گرد ہے
ان کا جو فرد ہے
اُس کے احساس میں ایک ہی درد ہے"

قُربِ اِحساس کے بے نشاں ، بے زباں
جتنے آہنگ ہیں
سب ہمارے لیے ایک ہی گیت کے
مختلف انگ ہیں ۔

سوچ کی دُوریاں
رُوح کے آئینے کے لیے زنگ ہیں ۔
ہم جہاں پر بھی ہوں ، جس طرح بھی رہیں
اپنی پرواز کا راستہ ایک ہے
ابتدا ایک تھی ، انتہا ایک ہے

۱۹
۷
۶۸

رابطے

ہاں ابھی سوچ لے ،
فیصلوں کا سفر
لفظ کی نرم چھاؤں میں کٹتا نہیں ،
اور سُن
فیصلوں کی ندامت سے تکلیف دہ کوئی بھی دُکھ نہیں ،
جتنے خدشے مرے ساتھ چلنے میں ہیں
اس دوراہے پہ رُک
اور اُنھیں اپنی آنکھوں میں ترتیب دے ،

جان لے ،
وقت کے دشتِ بے برگ میں واپسی کے لیے کوئی رستہ نہیں ،
(منظروں کا نیا پن پُرانی رُتوں کے لیے موت ہے)
جو ہُوا ، میرے جُملے کے آغاز میں

تیرے بالوں کو چھُوتے ہُوئے چل رہی تھی اُسی وقت سے
مر چکی ہے کہ اَب
اُس کا ہونا نہ ہونا ترے واسطے ایک ہے
(اور تجھ کو پتہ ہے کسی چیز کی
زندگی اُس تعلّق سے ہے جو کسی ذات کے رابطے سے بنے)
ہاں یہی وقت ہے
رابطے اور تعلّق کے معنی سمجھ،
جتنے خدشے مرے ساتھ چلنے میں ہیں
اِس دوراہے پہ رُک
اور انھیں اپنی آنکھوں میں ترتیب دے
کہ ابھی تیرے ہاتھوں کا ہر رابطہ
تیرے ہاتھوں میں ہے۔

۲۹
—
۷
—
۹۸

آخری بات

طلوعِ شمسِ مفارقت ہے ،
پُرانی کرنیں
نئے مکانوں کے آنگنوں میں لرز رہی ہیں
فصیلِ شہرِ وفا کے روزن
چمکتے ذرّوں سے بھر گئے ہیں ، چمکتے ذرّے !
گئے دِنوں کی عزیز باتیں
نگار صبحیں ، گلاب راتیں
بساطِ دل بھی عجیب شے ہے
ہزار جیتیں ، ہزار ماتیں
جُدائیوں کی ہَوائیں لمحوں کی خشک مٹی اُڑا رہی ہیں
گئی رُتوں کا ملال کب تک !
چلو کہ شاخیں تو ٹوٹتی ہیں

چلو کہ قبروں پہ خون رونے سے اپنی آنکھیں
ہی پھوٹتی ہیں

یہ موڑ وہ ہے جہاں سے میرے
تمھارے رستے بدل گئے ہیں
(پرانی راہوں پہ لوٹنا بھی ہماری تقدیر میں نہیں ہے)
کہ راستے بھی ہمارے قدموں کے ساتھ آگے
نکل گئے ہیں

طلوعِ شمسِ مفارقت ہے
تم اپنی آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے ستاروں
کو موت دے دو
گئی رُتوں کے تمام پھولوں تمام خاروں
کو موت دے دو،
نئے سفر کو حیات بخشو
کہ پچھلی راہوں پہ ثبت جتنے نقوشِ پا ہیں
غبار ہوں گے۔
ہوا اُڑائے کہ تم اُڑاؤ ــــــ!

۲۵
۹
۶۸

ہوائے شہرِ وفا شعاراں

ہوائے شہرِ وفا شعاراں
ہماری بستی کے پاس آئی تو ہم نے دیکھا
کہ اُس کے دامن میں بُوئے مقتل بسی ہُوئی تھی
اور اُس کی پھیلی ہُوئی نگاہوں میں خُوں کی سُرخی
چھلک رہی تھی۔
ہماری بستی کے پیڑ ششدر تھے، سَرد گلیاں،
مکاں، دریچے سبھی تعجب سے تک رہے تھے
عجیب طرزِ خرام تھا وہ کہ چلنے والے ٹھٹک رہے تھے!
ہَوا چھتوں کے سپاٹ ماتھوں کو چھُو کے گزری
تو کھڑکیوں کے نصیب جاگے
کہ آج بستی کی ساری خلقت کواڑ کھولے ہُوئے کھڑی تھی

ہر ایک نتھنے پُھلا پُھلا کے ہَوا کی خُوشبو کو سُونگھتا تھا
کہ جس میں خُوں کی مہک رچی تھی۔
تمام سینوں میں ایک خدشہ سوال بن کر دھڑک رہا تھا
تو آج شہرِ وفا شعاراں نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا
ہَوا نے چُپکے سے سر ہلایا،
ہَوا نے چُپکے سے سر ہلایا تو کھڑکیوں کے کواڑ کانپے
تو بیبیوں نے کھُلے سروں سے امیرِ مقتل کو بد دُعا دی
کہ جس کا خوفِ مہیب بستی کے چار جانب تنا ہُوا تھا
اور اپنے مَردوں کو چُوڑیاں دیں
کہ اُن کے ہاتھوں میں کچُھ نہیں تھا۔

ہَوا کی پاگل بنانے والی مہک نے دیوار و دَر سے پُوچھا
تمُھاری غیرت کو کیا ہُوا ہے؟
یہ کن مکینوں میں رہ رہے ہو!
تمام بستی پُکار اُٹھی
قَسم شہیدوں کے بہتے خوُں کی
قَسم سویروں کی، چاند راتوں کی

آبشاروں کی اور بچّوں کی ہم نے مقتل کو چُن لیا ہے ،
قسم ہے اُن کی کہ جن کے آنسو ہماری ہستی سے معتبر ہیں
اور اُن کی جن کے بدن ہمارے لہُو سے تخلیق پا رہے ہیں
اور اُن کی جن کے جوان بوسوں میں سُرخ پھولوں کی تازگی ہے
کہ ہم مقتل کو چُن لیا ہے
ہوائے شہرِ وفا شعاراں ، گواہ رہنا
گواہ رہنا کہ ہم نے خوفِ مہیب بستی کے بام و دَر سے ہٹا دیا ہے
ہمارے خُوں سے مہک کے اُٹھے تو اگلے شہروں کی سَمت جانا
اُنھیں بتانا

وفا کا رستہ سَروں کی کثرت سے پَٹ گیا ہے
کہ سرفروشی کی ابتدا ہے ،
اُنھیں بتانا کہ صحنِ مقتل بنا ہُوا ہے کوئے نگاراں
ہوائے شہرِ وفا شعاراں ، ہوائے شہرِ وفا شعاراں

۲۳
۱۱
۶۸

دُوسری جُدائی

تری خُوشبُو
ہَوا کے سبز دامن میں بَسی
تو سوچ نے آنکھوں میں خواہش کے دریچے کھول کر دِل سے کہا
"خدا شاہد
کہ ہم نے آج تک بِچھڑے ہوؤں کو پھر کبھی ملتے نہیں دیکھا،
مگر حیرت سماعت پر کہ یہ آہٹ اُسی کی ہے
جِسے تم نے گنوایا تھا،
جُدائی کی ہَوا جس کے مہکتے جسم کی خوشبو سے خالی تھی
جِسے کھونے کا لمحہ ہر نئے موسم کا حاصل تھا
ستارے جس کی صُورت دیکھنے ہر شب نکلتے تھے
نظارے ہاتھ مَلتے تھے۔"

(۲)

یکایک شہر کی گلیوں میں اُس کے نام کی خُوشبو اُڑی میں نے
رفاقت کے پرانے نرم لہجے میں اُسے آواز دی
اُس نے مجھے دیکھا
مگر اُس کی نگاہوں سے فقط حیرت ہویدا تھی
کہ جیسے پُوچھتا ہو اس تخاطب کا سبب کیا ہے !
وہی چہرہ ، وہی آنکھیں ، وُہی خوش وضع پیکر تھا
کہ جیسے موسموں کا گھُن اُسے چھُونے سے قاصر ہو !
میں بچّے کی طرح ششدر کھڑا تھا
اُس نے بالوں کو جھٹک کر ڈوبتے سُورج کو گھُورا
راستے کو آنکھ میں تولا ، مجھے دیکھا
" سفر لمبا ہے " وہ بولا ،
مری منزل تمھاری رہگزر سے سینکڑوں فرسنگ آگے ہے
خدا حافظ !

۱۲
۱۲
۶۸

نوحہ، غم ہی سہی

اے غمِ یار ٹھہر آج کی شب !
لگ چکی تیری سیاہی دل پر
آچکی جو تھی تباہی، دل پر
زرد ہے رنگ نظر آج کی شب
خاک کا ڈھیر ہوئے خواب نگر
آج کی شب
اے غمِ یار ٹھہر آج کی شب

کم نظر دیکھ ہَوا کی آہٹ
کس کی خوشبو میں بسی آتی ہے !
کون سا عکس ہے جس کی خاطر
آنکھ آئینہ بنی جاتی ہے !

کِس طرح چاند اچانک جُھک کر

سرِ شاخوں سے لپٹ جاتا ہے

کِس طرح رنگِ چمن

ایک چہرے میں سمٹ جاتا ہے

سیلِ امواجِ تمنّا کیسے

ساحلِ دل سے پلٹ جاتا ہے!

اور کس طور سے طے ہوتا ہے

لڑکھڑاتے ہُوئے تاروں کا سَفر آج کی شب

بے ہُنر! آج کی شب

مجُھ کو جی بھر کے اُسے یاد تو کر لینے دے

دولتِ دَرد سہی جیب تو بھر لینے دے۔

۲۳

۱

۶۹

بے نام منزلوں کا سَفر

ہَوا نظر کے تہی دریچوں میں جانے والے کو ڈھونڈتی ہے
گُلِ تماشا نجانے کب اور کہاں سے پھُوٹے !
ہر ایک منظر پہ اُس کی خوشبو نے حیرتوں کے عَلَم گڑے ہیں
تلاش رَستے بہت کڑے ہیں
کہیں سے شمسِ مُراد اُبھرے تو سحرِ شب ہائے کہر ٹُوٹے
بِکھرتے خوابوں کا ساتھ چھُوٹے
گزُرتے لمحوں کا راستہ بھی عجیب جادو کا سِلسلہ ہے
کہ مَیں کھڑا ہُوں پہ چل رہا ہے

کہیں وہ غوغا کہ بات مُشکل
کہیں وہ چُپ کہ حیات مُشکل
کہیں وہ عالم کہ سانس اٹکے
کہیں ہَوا سے نجات مُشکل
ہر ایک سائے میں اُس کا پیکر عجیب جادُو جگا رہا ہے
اُسی کی خوشبو ہر ایک منظر کی زندگی ہے
کہ جس کی فرقت کے سَرد وقفے نے آرزو کے جہان لُوٹے
گلِ تماشا نجانے کب اور کہاں سے پھُوٹے
ہَوا نظر کے تہی دریچوں میں جانے والے کو ڈھونڈتی ہے

۵
۲
۶۹

سمندر، آسمان اور میں

کھُلیں جو آنکھیں تو سر پہ نیلا فلک تنا تھا
چہار جانب سیاہ پانی کی تند موجوں کا غلغلہ تھا۔
ہوائیں چیخوں کو اور کراہوں کو لے کے چلتی تھیں اور مٹی
کی زرد خُوشبو میں موت موسم کا ذائقہ تھا۔
نظر مناظر میں ڈوب کر بھی مثالِ شیشہ تہی تھی یعنی
گُلِ تماشا نہیں کھِلا تھا
ہراس جذبوں کی رہ گزر میں دلِ تعجب زدہ اکیلا،
خموش، تنہا بھٹک رہا تھا

کہ ایک سائے کی نرم آہٹ نے راستوں کا نصیب بدلا
کوئی تعلق کے چاند لہجے میں اپنے پن کی اَدا سے بولا

" مرے مُسافر اُداس مت ہو کہ عہدِ فرقت ہی زندگی ہے
یہ فاصلوں کی خلیج راہِ وصال ہے اور طلب نگاہوں
کی روشنی ہے

تمام چیزیں تمھارے میرے
بدن کے رشتوں کا سلسلہ ہیں
تمھیں خبر ہے کہ ہم سمندر
اور آسمانوں کی انتہا ہیں ! "

۶
۲
۶۹

اِسرافیل کہاں ہے !

بستیوں میں ظلم کا پرچم کھُلا
لوگ پھر اندھے سفر کی راہ میں حائل ہُوئے
پھر طلسمِ بابِ شہرِ غم کھُلا
پھر بدن سڑکوں پہ گِرتے خوں سے اپنی کشمکش کی داستاں لکھنے لگے !
چوک دہشت ہول کا منظر بنے !
مَرمَریں بانہوں میں ٹوٹی چوڑیوں کی کرچیاں اُتریں
تو سینے یاد کے محشر بنے !
پھر کئی ماؤں کی آنکھیں زینتِ دَر ہوگئیں اور منتظر کانوں میں
کھوئی آہٹوں کے گھر بنے !
آرزو کے راستے پتّھر بنے !

جبر کی منزل میں ہے! ــــ ہر ایک شے

کیوں زمیں پھٹتی نہیں، اندھیر ہے!

آسمانو، دیکھتے ہو کِس کا مُنہ

کیا دیر ہے!

کوہسارو، رُوئی کے گالے بنو

اور اے سمندر، ساحلوں کے باب سے باہر نکل

نقشِ فردا ــ خواب سے باہر نکل

۱۵
۲
۶۹

بُزدل

ہجومِ سنگِ انا اور ضبطِ پیہم نے
مثالِ ریگِ رواں بے قرار رکھا ہے
مِرے وجود کی وحشت نے رات بھر مجھکو
غبارِ قافلۂ انتظار رکھا ہے
بہ پیشِ خدمتِ چشمِ سراب آلُودہ
ہوا نے دستِ طلب بار بار رکھا ہے۔

میں تیری یاد کے جادُو میں تھا، سحر مُجھ کو
نجانے کون سی منزل پہ لا کے چھوڑ گئی
کہ سانس سانس میں تیرے بدن کی خُوشبو ہے
قدم قدم پہ تری آہٹوں کا ڈیرا ہے
مگر نظر میں فقط شب زدہ سویرا ہے

تہی تہی سے مناظر ہیں گرد گرد فضا
متاعِ عمر وہی ایک خواب تیرا ہے ۔

ترے جمال کا پرتو نہیں مگر پھر بھی
خیال آئنہ خانہ سجائے بیٹھا ہے
جدھر بھی آنکھ اُٹھاتا ہوں ایک وحشت ہے
تو ہی بتا کہ کہاں تک فریب دُوں خُود کو !
کہ میرا عکس مرے خوف کی شہادت ہے ،

مرا وجود ہے اور شہرِ سنگباراں ہے
بچاؤں جان کہ تعمیرِ قصرِ ذات کروں !
میں اپنا ہاتھ بغل میں دبائے سوچتا ہوں
مرے نصیب میں سُورج کہاں جو بات کروں ،

میں وادیوں کی مسافت سے کس لیے نکلوں !
سفر اک اور پہاڑوں کے پار رکھا ہے ۔

۳
۴
۶۹

گھروں سے نکلے ہو اَب تو دیکھو

کہا ہواؤں نے جانے والو،
"گئے ہُوؤں کی تلاش کارِ فضول ہے کہ سُراغِ رفتہ کِسے مِلا ہے!
یہ تم جو آنکھوں میں آرزُوں کے جھِلملاتے چراغ لے کر
سیاہیوں میں بھٹک رہے ہو، تمہی بتاؤ
زمینِ مُردہ سے کوئی غُنچہ کبھی کِھلا ہے!"

خیال رستے خراب فطرت امین ہیں
جو گئے ہُوؤں کے عزیز قدموں کی سرگزشتیں سُنا رہے ہیں
گلاب جسموں کی سبز خُوشبو اور آہٹوں کی حیات دستک
سے وصل خواہش جگا رہے ہیں۔

مگر جو پُوچھو کہ اب کہاں ہیں
وہ شوق چہرے، سوال آنکھیں!

تو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ جیسے الفاظ اپنے معنی سے کٹ گئے ہوں
غبارِ ابہام بے نشاں میں تمام جُملے سمٹ گئے ہوں
کہا مُسافت نے جانے والو،
" سفر بَلاؤں کا اِک سمندر ہے جو سراپا بھنور ہے
گئے ہُوؤں کا خرام سیلِ ہَوائے صحرا سا بے اماں ہے
کہ جو مقاموں سے بے خبر ہے
سراب آنکھوں سے مُعتبر ہے
ہر ایک منظر کے بازوؤں پہ قبائے رنگِ زوال ہے اور
شکست خوابوں کی ہم سفر ہے۔"

کہا ستاروں نے جانے والو،
" مگر پرانے بہار رشتوں کی اُستواری کا شوق راہِ وصال ہے
اور بازگشتِ حروفِ کہنہ میں لفظِ تازہ کی زندگی ہے۔
گھروں سے نکلے ہو اَب تو دیکھو
سکونِ مرگِ وُجود ہے اور تلاشِ آنکھوں کی روشنی ہے
کہ تیرگی کے سفر کی منزل گئے ہُوؤں سے دَمک رہی ہے "

جادُو کا شہر

حرف لفظوں سے جُدا ہیں
کوَرچشمِ باز ہے،
کون سا دشمن ہے میرا
کون سا ہمراز ہے!
سینکڑوں چہرے ہیں لیکن
آشنا کوئی نہیں
ایک سی شکلیں ہیں سب کی
ایک سی آواز ہے۔

۵
۶
۶۹

اندیشہ

ضروری نہیں ہے ،
ضروری نہیں ہے جو ساحل کی گیلی خنک ریت پر
ہاتھ میں ہاتھ دے کر
سَفر اور تلاطم کے قِصّے سُنائے ،
جزیروں ، ہَواؤں اور اَن دیکھے موسم
اور آنکھوں سے اوجھل کناروں پہ بِکھرے
ہُوئے منظروں ، ذائقوں اور رنگوں کی باتیں کرے
وہ ان واردتوں سے گُزرا بھی ہو !

گر کہے ، آؤ ہم ان پریشاں موجوں کا پیچھا کریں
جو ترے اور مرے پاؤں کو چُومتی ہیں

تلاطم کی بے نام منزل سے گزریں
یہ دیکھیں ہوائیں کِسے ڈھونڈتی ہیں!"
تو چلنے سے پہلے ذرا سوچ لینا
ضروری نہیں ہے جو اَندیکھے رستوں کی خبریں سُنائے
وہ ان راستوں کا شناسا بھی ہو۔
کہیں یہ نہ ہو جو سمندر میں تم اُس کو ڈھونڈو تو وہ
ساحلوں پہ کھڑا مُسکراتا رہے۔

۵
۶
۶۹

تجدید

اب مِرے شانے سے لگ کر کس لیے روتی ہو تم !
یاد ہے ، تم نے کہا تھا ،
" جب نگاہوں میں چمک ہو
لفظ جذبوں کے اثر سے کانپتے ہوں اور تنفّس
اِس طرح اُلجھیں کہ جسموں کی تھکن خوشبُو بنے ،
تو وہ گھڑی عہدِ وفا کی ساعتِ نایاب ہے ۔
وہ جو چپکے سے بچھڑ جاتے ہیں لمحے ہیں مُسافت
جن کی خاطر پاؤں پر پہرے بٹھاتی ہے ۔
نگاہیں دُھند کے پردوں میں اُن کو ڈھونڈتی ہیں
اور سماعت اُن کی میٹھی نرم آہٹ کے لیے
دامن بچھاتی ہے "
اور وہ لمحہ بھی تم کو یاد ہوگا
جب ہوائیں سرد تھیں اور شام کے میلے کفن پر
ہاتھ رکھ کر

تُم نے لفظوں اور تعلق کے نئے معنی بتائے تھے ، کہا تھا
" ہر گھڑی اپنی جگہ پر ساعتِ نایاب ہے
حاصلِ عُمرِ گریزاں ایک بھی لمحہ نہیں
لفظ دھوکہ ہیں کہ ان کا کام ابلاغِ معانی کے علاوہ کچھ نہیں '
وقت معنی ہے جو ہر لحظہ نئے چہرے بدلتا ہے ۔
جانے والا وقت سایہ ہے
کہ جب تک جسم ہے یہ آدمی کے ساتھ چلتا ہے ،
یادِ مثلِ نطقِ پاگل ہے کہ اس کے لفظ معنی سے تہی ہیں ۔
یہ جسے تم غم ، اذیّت ، درد ، آنسو
دُکھ وغیرہ کہہ رہے ہو
ایک لمحاتی تأثر ہے تمھارا وہم ہے ،
تم کو میرا مشورہ ہے ، بھُول جاؤ تم سے اَب تک
جو بھی کچھُ میں نے کہا ہے "
اَب مِرے شانے سے لگ کر کس لیے روتی ہو تم !

۷
۷
۶۹

اے دلِ بے خبر

اے دلِ بے خبر
جو ہَوا جا چکی اَب نہیں آئے گی
جو شجر ٹوٹ جاتا ہے پھلتا نہیں،
واپسی موسموں کا مقدر تو ہے
جو سماں بیت جائے پلٹتا نہیں
جانے والے نہیں لَوٹتے عُمر بھر
اَب کسے ڈھونڈتا ہے سرِ رہ گزر!
اے دلِ کم نظر، اے مرے بے خبر، اے مرے ہم سفر
وہ تو خوشبو تھا اگلے نگر جا چُکا
چاندنی تھا ہوا صرفِ رنگِ قمر

خواب تھا آنکھ کھلتے ہی اوجھل ہُوا

پیڑ تھا رُت بدلتے ہُوا بے ثمر

اے دلِ بے اثر، اے مِرے چارہ گر

یہ ہے کِس کو خبر!

کب ہوائے سفر کا اشارہ ملے!

کب کھلیں ساحلوں پر سفینوں کے پَر!

کون جانے کہاں منزلِ موج ہے!

کِس جزیرے پہ ہے "شاہ زادی" کا گھر اے مِرے چارہ گر

اے دلِ بے خبر، کم نظر، معتبر

تو کہ مُدّت سے ہے زیرِ بارِ سفر

بے قرارِ سفر

ریل کی بے ہُنر پٹڑیوں کی طرح

آس کے بے ثمر موسموں کی طرح

بے جہت منزلوں کی مُسافت میں ہے

رستہ بھولے ہُوئے رہرَوں کی طرح

پہ چوبِ نارِ سفر،

اعتبارِ نظر — اعتبارِ نظر کِس گماں پر کریں

اے دلِ بے بصر

یہ تو ساحل پہ بھی دیکھتی ہے بھنور
ریت میں کشت کرتی ہے آبِ بقا
کھولتی ہے ہواؤں میں بابِ اثر
تجھ کو رکھتی ہے یہ زیبِ دارِ سفر، بے قرارِ سفر

اے دلِ بے ہنر،
گرم سانسوں کی وہ خوشبوئیں بھول جا
وہ چہکتی ہوئی دھڑکنیں، بھول جا
بھول جا نرم ہونٹوں کی شادابیاں
حرفِ اقرار کی لذّتیں، بھول جا
بھول جا وہ ہَوا، بھول جا وہ نگر
کون جانے کہاں روشنی کھوگئی
لُٹ گیا ہے کہاں کاروانِ سحر!
اب کہاں گیسوؤں کے وہ سائے، کہاں
اُس کی آہٹ سے چمکے ہُوئے بام و در، اے دلِ بے بصر
رنگِ آسودگی کے تماشے کہاں
جھٹپٹا ہے یہاں رہگزر رہگزر،

وہ تو خُوشبو تھا اگلے نگر جاچُکا
اَب کِسے ڈھونڈتا ہے ارے بے خبر،
جانے والے نہیں لوٹتے عُمر بھر
اے دلِ کم نظر، اے مرے چارہ گر، اے مرے ہم سَفر

۴
۸
۶۹

بازدید

میں بھولا نہیں ہوں محبت کا وہ سب سے دُشوار لمحہ
وہ لمحہ جو اُس دِن مرے واسطے لمحۂ آخری بن رہا تھا
جُدائی کا وہ موت آثار لمحہ، وہ تلوار لمحہ
وہ سوئی ہوئی شب کا بیدار لمحہ۔
"وہ تم اور تمھارا وہ پژمُردہ چہرہ وہ سہمی نگاہیں
وہ ہونٹوں کے گوشوں پہ سمٹی کراہیں
ہراساں قدم اور پریشان باہیں
وہ آنسو وہ آہیں"
مری آنکھ میں آج تک نقش ہے وہ لرزتا ہوا سا پُر اسرار لمحہ
وہ دیوار لمحہ
مجھے یاد ہے تم بہت دیر تک میرے شانے پہ موتی سجاتے رہے تھے
مری گرم باہنوں میں لپٹے ہوئے کپکپاتے رہے تھے

جدائی کی تمہید میں ایک لمبی پُرانی کہانی سُناتے رہے تھے،
مجھے ساتھ اپنے رُلاتے رہے تھے،
مَیں بھُولا نہیں ہُوں تعلّق کی باتیں
کہ میرے لبوں پر تمھارے لبوں کے کِھلائے ہوئے سب شگوفے جواں ہیں
تمھارے بدن کی وہ سب والہانہ آیتیں مرے سر و ہاتھوں پہ اَب تک عیاں ہیں
وہ قربت کی خوشبو میں سرشار لمحے، مرے چار جانب ابھی تک رواں ہیں
زمانہ بھی لیکن عجب سحر زا چیز ہے
جو ابھی لب پہ کرنیں سجائے کھڑا تھا ابھی اپنی ہی آگ میں جل رہا ہے
ہر اِک پل نئی شکل میں ڈھل رہا ہے،

مَیں بھُولا نہیں ہُوں
جُدائی کا وہ موت آثار لمحہ، وہ تلوار لمحہ
جو اُس دِن مرے واسطے لمحۂ آخری بن رہا تھا
مگر اَب ہے صرف ایک بے کار لمحہ ـــ

۵
۹
۶۹

جائزہ

رستہ رستہ، تنہائی کی گرد اُڑی
اور جب میں کالے کوس گزر کر اُس کی رہ پر آن لگا تو
رُسوائی نے شہر سے باہر آکر اِستقبال کیا،
ہر جانب سے شعلہ بار نگاہیں اُٹھیں، آوازوں کے پتّھر برسے
ناکامی کے زہر میں ڈوبے خنجر برسے'
سفر سے تو میں بچ نکلا تھا منزل نے پامال کیا۔'

مَیں نے رُک کر زخمی پاؤں، خاک بھرے سَر بوجھل آنکھوں
پیاس سے سُوکھے خشک لَبوں
اور اُس کے شہر کی اُونچی، پکّی سُرخ فصیلوں کو دیکھا
اور اپنے ششدر دل سے پُوچھا

"اِسی لیے کیا مجھ کو اِتنی دُور سے لے کر آیا تھا!
یہی نگر تھا جس کے انوکھے بام و دَر کے
مہکی گلیوں، اُجلے کوچوں، چہروں سے آباد دریچوں
اور وفا کے پھُول کھِلاتے شام و سحر کے
کومل، میٹھے خواب دکھا کر
مجھُ کو اتنے خاک اُڑاتے کالے کوس چلایا تھا!
مجھُ سے میرا اپنا شہر چھڑایا تھا"

خلقت کے آوازے تو میں اپنے گھر میں بھی سُنتا تھا
وہاں بھی گلیوں، بازاروں سے سنگِ ملامت ہی چُنتا تھا
گھر تھا تو دروازہ بھی تھا،
لوگوں سے چھُپ سکتا تھا
دیواریں تھیں جن سے لگ کر رو سکتا تھا
خاموشی تھی، سو سکتا تھا۔

۲۱
۱۰
۶۹

ایک کہانی

میں تنہا تھا، سرد ہَوا تھی،
رات کے پچھلے پہر کی کالی خاموشی تھی
پیڑوں کے چہروں پہ اِک بے نام تحیّر تھا جیسے وہ
میرے پیچھے کوئی دشمن دیکھ رہے ہوں،
دُور دُور تک چاروں جانب ویرانی کا جال تَنا تھا،
میں اس منظر کی ہیبت سے خائف تھا
اور اپنے دل میں سوچ رہا تھا

"آگے میرے دوست کھڑے ہیں،
جنگل کے اُس پار نہایت بے چینی سے
میرا رستہ دیکھ رہے ہیں،
اُن کی رَس میں ڈُوبی باتیں، چاہت سے معمور نگاہیں
پھیلی باہیں
میرے غم کا مرہم ہوں گی
سَفر صعُوبت سُن کر اُن کی آنکھیں شبنم شبنم ہوں گی
جب میں اُن کو وہ سب چیزیں جو میں جنّوں
اور دیووں سے لڑ کر لایا ہُوں، دُوں گا تو اُن کے چہرے کِھل اُٹھیں گے
وہ پُوچھیں گے! . . . . . "

ابھی میں دل میں اُن کے سوالوں کے جُملے ہی سوچ رہا تھا۔
یکدم مجُھ پر جانے کہاں سے کچُھ سائے سے ٹُوٹ پڑے،
میرے سینے اور کندھوں میں اُن کے ٹھنڈے خنجر اُترے،
خوُں بہا تو میں نے بچنے کی کوشش میں اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے
لیکن میرے ہاتھ نہیں تھے!

میری آنکھوں کے آگے سے ساری چیزیں

ڈُوب رہی تھیں ، سائے مجُھ پر

جھپٹ جھپٹ کر وہ سب چیزیں لُوٹ رہے تھے

جن کی خاطر میرے ساتھی جنگل کے اُس پار کھڑے تھے !

یکدم اک بجلی سی چمکی

میں نے اُن سایوں کو دیکھا ، میں نے دیکھا اور پہچانا

وہ سب میرے .... وہ سب میرے ..... وہ ..... سب .... میرے

۱۵
۱۱
۶۹

سلسلے خیالوں کے

مگر وہ مجھ سے عظیم تر ہے
مرے تعلق بغیر اس کا وجود ہر چند بے اثر ہے
مگر وہ مجھ سے عظیم تر ہے۔
گزرتے لمحو، مجھے بتاؤ کہ زندگی کا اُصول کیا ہے!
تمام چیزیں اگر حقیقت میں ایک ہی ہیں
تو پھول کیوں ہے ببول کیا ہے!
جو میری آنکھوں کے دائرے میں، ہزار رنگوں میں منتشر ہے
ہر ایک منظر، ہر ایک آہٹ، ہر ایک رستے کا ہم سفر ہے
کہیں سمندر سا محوِ حیرت کہیں ہواؤں سا بے خبر ہے
کہیں بیاباں مثال خالی، کہیں صداؤں سے پُر نگر ہے
یہ سب تماشا، مری ہی خواہش کا عکس گر ہے
تو پھر بتاؤ، سوائے خواہش کے میرے ہاتھوں میں کیا ہُنر ہے

گھروں سے نکلو تو سوچ لینا

کہ بے گھری کا حصول کیا ہے !

دلوں کی تعمیر مت گراؤ کہ خواہشوں کا یہی تو گھر ہے ۔

(۲)

تمام ہاتھوں میں آئنے ہیں تو کون کس سے چھپا ہُوا ہے !

اگر صدا کا وجود کانوں سے منسلک ہے

تو کون خُوشبو میں بولتا ہے !

اگر سمندر کی حد ہے ساحل

تو کون آنکھوں میں پھیلتا ہے !

تمام چیزیں اگر یہی ہیں

تو کون چیزوں سے ماورا ہے ،

کِسے خبر ہے بدلتی رُت نے پُرانے پتّوں سے کیا کہا ہے ،

یہ کون بادل سے جا کے پُوچھے کہ اتنے موسم کہاں رہا ہے !

جو آج دیکھا ہے کل نہ ہوگا

کوئی بھی لمحہ اٹل نہ ہوگا

اگر زمیں پر تمھارے میرے قدم نہ پڑتے تو کون ہوتا !
یہ ایسا جادُو ہے جو حسابوں سے حل نہ ہوگا ۔
ہزار منظر قدم سے لپٹیں گزرنے والے نہیں رُکیں گے ،
ہوا جو تحریر لکھ کے جائے گی
اُس پہ کوئی عمل نہ ہوگا ۔
ذرا تمنا کی شکل دیکھو، تمھارے آنے کی منتظر ہے !

(۳)

" ہواؤ اُس کی گلی سے گزرو تو اُس کو میرا سلام کہنا "
مجھے خبر ہے کہ میرے گھر سے گزرنے والی ہوا کا رستہ
تمھارے گھر تک نہیں گیا ہے،
سلام میرا تمھارے کانوں سے نارسا ہے
میں جانتا ہُوں یہ بچپنا ہے
مگر حقیقت کو جان کر بھی نہ جاننے میں عجب مزا ہے
ہَوا سے مَیں نے یہ پھر کہا ہے،
" گزر رہے ہیں تمھاری یادوں کے دم سے ہی صبح و شام کہنا

ہواؤ اُس کی گلی سے گزرو تو اُس کو میرا سلام کہنا "
تمہارے گھر کا کسے پتہ ہے ہَوا کے رُخ کی کسے خبر ہے !!

(۴)

گزرتے لمحو، میں تھک گیا ہوں، بکھر گیا ہوں
مَیں ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہوں
یہ ساتھیوں کی مفارقت بھی عجیب شے ہے
کہ جتنا عرصہ یہ ساتھ چلتے ہیں
چھوٹی چھوٹی فضول باتوں پہ روٹھ جاتے ہیں اور لڑتے ہیں
دوستوں کے جواں ارادے شکست کرتے ہیں
راستے کی صعوبتوں سے انہیں ڈراتے ہیں آپ ڈرتے ہیں
منزلوں کو پُکارتے ہیں
مگر انہی کے وجود ہیں جو مسافتوں کو نکھارتے ہیں
گزرتے لمحو میں ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہوں
میں اپنی تنہائی کے تحیّر سے ڈر گیا ہوں
میں وہ مُسافر ہُوں جس کے پاؤں میں منزلیں ہیں نہ رہگزر ہے۔

(۵)

مری نگاہوں کے آئنوں میں عجیب منظر جھلک رہے ہیں
کہیں اُجالوں پہ تیرگی ہے کہیں اندھیرے چمک رہے ہیں
کہیں شگوفوں میں روشنی ہے کہیں دریچے مہک رہے ہیں
کہیں پہ صدیاں رُکی کھڑی ہیں، کہیں زمانے بھٹک رہے ہیں
سفر ہے کیسا کہ میرے پاؤں بغیر چلنے کے تھک رہے ہیں
میں اپنی آنکھوں میں جھلملاتے گئے زمانوں کو دیکھتا ہُوں
گئے زمانے، کہ جن کے شانوں سے سبز آنچل ڈھلک رہے ہیں
گئے زمانے، وہ کارواں ہیں کہ جن کے رُکنے میں بھی سفر ہے۔

(۶)

خموش پیڑو،
تُمھارے سائے میں کتنی نسلوں نے دم لیا ہے!
مجھے بتاؤ کہ موٹروں کے دُھوئیں سے پہلے جو گرد اُڑتی تھی
اُس کے پردے سے آنے والے مسافروں میں کمال کیا تھا
مجھے بتاؤ کہ مُجھ سے پہلے گئے ہوؤں کا جمال کیا تھا

تمُھاری آنکھیں تو چاند سُورج کی اِبتداؤں سے آشنا ہیں
مجھے بتاؤ کہ پہلے سُورج کا حال کیا تھا!
تمُھارے شانوں پہ چاندنی کی طویل زُلفیں بِکھر کے مہکیں
تو آسماں کو ملال کیا تھا !
تمھارے قدموں میں سر جُھکاتے اُداس رستے کی بندگی میں
سوال کیا تھا !
ہوائیں پہلی دفعہ چلیں تو تمُھارے دِل میں خیال کیا تھا !
تمُھاری شاخوں نے کِن گھٹاؤں کی بے قراری سے نم لیا ہے !
مجھے بتاؤ جو سب سے پہلے
تمھارے سائے میں آکے ٹھہرا تھا اُس مسافر کی کیا خبر ہے !

(۷)

اُجاڑ شہرو
تمھاری گلیوں میں چلنے والے کِدھر گئے ہیں !
گلاب چہرے،
کہ جن سے راتوں میں روشنی تھی کہاں چُھپے ہیں !

گزُرتی صدیوں نے جانے کیسی زباں میں اپنے اَلم لکھے ہیں !
شکستہ اینٹوں پہ درج کیا ہے ،
عبارتیں ہیں کہ زاویے ہیں !
مجُھے یقیں ہے اُجاڑ شہرو
کہ اب سے پہلے بھی میرے پاؤں تمھاری مٹی کے جادوُں سے
گزُر چُکے ہیں

میں اپنے شہروں کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں
زمانہ آئے گا جب یہ چہروں سے پُر دریچے
نظر میں کھِلتی بہار گلیاں، نگار کوچے اُجاڑ ہوں گے ،
رُکیں گی مٹی سے آبشاریں سمندروں میں پہاڑ ہوں گے ،
مجھے یقیں ہے اُجاڑ شہرو
نئی پُرانی تمام چیزوں میں رابطے ہیں
کہ سب زمانے روایتوں کے تلازمے سے ملے ہُوئے ہیں ۔
گزُرتے لمحوں کے سلسلوں سے کسے مُفر تھا، کسے مُفر ہے !۔

(۸)

گزرتے لمحو ، مجھے بتاؤ زمین کس کی تلاش میں ہے !

ستارے کیا چیز ڈھونڈتے ہیں !
وہ کیا تحیّر تھا جس میں اَب تک پہاڑ گُم سُم کھڑے ہُوئے ہیں !
سمندروں کا جمال کیا ہے کہ سَرد چشمے تڑپ رہے ہیں !
بدلتی رُت کا پیام کیا ہے کہ پیڑ اُلجھن میں پڑ گئے ہیں !
مجھے بتاؤ وہ رنگ کیا ہے جو میرے اندر ہے اور مجھ پر عیاں نہیں ہے !
وہ کیا صدا ہے کہ جس کی کوئی زباں نہیں ہے !
وہ کون ہے جو کہیں نہیں پر کہاں نہیں ہے !
مِرے قلم سے جو لفظ نکلے ہیں سب اُسی کے رکھے ہُوئے ہیں ،
سوائے خواہش مِری تمنّا کے سرد ہاتھوں میں کیا ہُنر ہے
میں اُس کو جھک کے سلام کرتا ہوں جو مُجھی میں قیام کرتا ہے
اور مُجھ سے عظیم تر ہے

۲۶
۱۲
۶۹

چشمِ بے خواب کو سامان بہت

چشمِ بے خواب کو سامان بہت !
رات بھر شہر کی گلیوں میں ہوا
ہاتھ میں سنگ لیے
خوف سے زرد مکانوں کے دھڑکتے دل پر
دستکیں دیتی چلی جاتی ہے ،
روشنی بند کواڑوں سے نکلتے ہوئے گھبراتی ہے ،
ہر طرف چیخ سی چکراتی ہے ،
ہیں مرے دِل کے لیے درد کے عنوان بہت !

دَرد کا نام سماعت کے لیے راحتِ جاں ،
دستِ بے مایہ کو زر
نطقِ خاموش کو لفظ

خوابِ بے در کو مکاں
دردکا نام مرے ، شہرِ خواہش کا نشاں
منزلِ ریگِ رواں
درد کی راہ پہ تسکیں کے امکان بہت !

ہجر کا درد کٹھن ہے پھر بھی
وہ بھی اُس روز بچھڑ کر مجھ سے
خُوش تو نہ تھی،
اُس نے یہ منزلِ غم
کس طرح کاٹی ہو گی !
وہ بھی تو میری طرح ہو گی پریشان بہت
(درد کی راہ میں تسکین کے سامان بہت !)

کیا خبر اس کی سماعت کے لیے
دردکا نام بھلا ہو کہ نہ ہو
شہرِ خواہش کا نشاں
نطقِ خاموش کا اظہار ہوا ہو کہ نہ ہو

دستِ بے مایہ کا زر (وہ تہی دست نہ تھی)
ہجر کا دزد بنا ہو کہ نہ ہو

اُس کی گلیوں میں رواں
دستکیں دیتی ہُوئی سُرخ ہَوا ہو کہ نہ ہو!

عشقِ نوخیز کے ارمان بہت،
شوقِ گُل رنگ کے رستے میں بیابان بہت،
سوختہ جان بہت،
چشمِ بے خواب کو سامان بہت،

۱۹
۲
۷۰

ہَوا میری رہبر

ہواؤں کی آہٹ پہ چلتے رہو
حقیقت مرے اور تمھارے خیالوں کی بے اَنت منزل
سے بھی کچھ بڑی ہے،
ہواؤں کی تحریر کس نے پڑھی ہے!
تم اچھی طرح جانتے ہو زمانہ
اِک اندھا مُسافر ہے جو اجنبی شہر کی
تنگ، بے رنگ گلیوں میں لاٹھی گنوا کر پھسلتا سنبھلتا چلا جا رہا ہے
سمندر کی نیرنگیوں کی حقیقت پہاڑوں کے نوحوں کا اِک سلسلہ ہے،
(سُنا ہے کہ چیزوں کی تخلیق دراصل اِک حادثہ ہے)
حادثوں کے مقدر کی کس کو خبر ہے؟
مقدّر، وہ اِک لفظِ مبہم کہ جس کے تحیّر میں ہارے ہُوؤں کا مُفر ہے
ہَوا میری رہبر، ہوا میرا رستہ، ہَوا ہم سفر ہے

تمھیں تو پتہ ہے، ہَواؤں کی زنجیر
ہم سب کے پاؤں میں، ہاتھوں میں، آنکھوں میں، ہونٹوں میں
اور خواہشوں میں پڑی ہے۔
ہواؤں کے رستے سے جو بھی ہٹتا ہے،
اُسے اجنبیت کا سُم کھا گیا ہے،
(تمھی نے کہا تھا رفاقت کا صحرا ابھی تنہائی کے شب کدے سے بھلا ہے)

تمنّا کے قصّے میں رکھا ہی کیا ہے!
بجز دردِ حاصل،
ہَوا کے تغافل سے دل ہارتے ہو، مگر یہ بھی سوچو،
ہوا دل کا رستہ، ہوا دل کی منزل،
ہواؤں کی اُنگلی کو تھامے رہو، مُسکراتے رہو،
ہواؤں کی تحریر کس نے پڑھی ہے!
ہَواؤں کی آہٹ پہ چلتے رہو،

۲۰
۲
۷۰

اے، ہجر زدہ شب

اے، ہجر زدہ شب،
آ تو ہی میرے سینے سے لگ جا کہ بٹے غم،
احساس کو تنہائی کی منزل سے ملے رہ
آواز کی گمنام زمینوں کو ملے نم
آ کچھ تو گھٹے غم
اس ساعتِ مہجور کی فریاد ہو مدھم
کیوں نوحہ بلب پھرتی ہے محرومِ مخاطب!
اے، ہجر زدہ شب!

دیکھ آج تمناؤں کی بے سمت ہوائیں
دلِ شرمندہ نظر کو
پھر لے کے چلی ہیں وہی بے رخت ہوائیں
اسی جادو کے نگر کو،

جس خاک پہ اُترے تھے مُرادوں کے صحیفے
سنکی تھی جہاں سبز ہَوا، کوئے وفا کی
مہکے تھے جہاں پھُول صفت رنگ کسی کے!
اُس خاک کا ہر روپ مِرے واسطے زندان
کچُھ روٹھے ہُوئے خواب ہیں،
کچُھ ٹوٹے ہُوئے مَان
کچُھ برسے ہُوئے اَبر ہیں، کچُھ ترسے ہُوئے لب،
اے ہجر زدہ شب،

آ تو ہی گلے لگ کے بتا، کون یہاں ہے!
جُز خود سرِیِ موجِ ہوا، کون یہاں ہے!
ہمدرد مرا، تیرے سوا، کون یہاں ہے!
آ چُوم لُوں آنکھیں تری، رُخسار ترے، لب
اے ہجر زدہ شب۔

۲۰
۳
۷۰

ایمان کے محافظوں سے

مَیں خداوندِ برتر کی تخلیق ہُوں ،
جس نے پھُولوں کو خُوشبُو ، درختوں کو چھاؤں
سمندر کو پانی ، ہواؤں کو چلنے کی طاقت عطا کی ،
ستارے ، زمیں ، چاند ، سُورج ، بنائے
میں کہتا ہُوں سب آدمی ، آدمی ہیں
نہیں کوئی بہتر کِسی سے
سوا اُن کے جو متّقی ہیں ،
میں کہتا ہوں اس خاک پر زندہ رہنے کا حق سب کو ہے ،
سب کو حق ہے کہ محنت کی تخلیق سے اپنے دامن بھریں !
اس زمیں پر چلیں ، آبرو سے رہیں ، دل کی باتیں کہیں !
مُسکرا بھی سکیں ،
جس کی خواہش کریں اُس کو پا بھی سکیں ،

میں کہتا ہوں سب ابنِ آدم ہیں تو
کیوں نہ سب کو برابر کی عزّت ملے
کیوں کوئی کج کلاہی کے نشّے میں ہو
کیوں کسی کو فقط مرگِ تہمت ملے'۔

میں اُن تیرہ بختوں، سیہ قسمتوں کے لیے روشنی مانگتا ہُوں
جنھیں تم نے صدیوں تک اپنی غرض اور اَنا کی بقا کے لیے
پتّھروں کی طرح بے حقیقت گِنا ہے'۔
مَیں اُن کے لیے بولتا ہوں جنھیں
تم نے اپنی فصاحت کے طوقِ تو ہم میں جکڑا ہُوا ہے
جسے تم نے ہر دَور میں ظُلم کے ہاتھ بیچا ہے،
میرا خُدا ہے۔

۲۳
۴
۷۰

اختیار

کہا اُس نے ، دیکھو ،

تمنّا کے رستے بہت بے خبر ہیں

جو آگے گئے تھے سماعت کے جادُو میں کھوئے ہُوئے ہیں ۔

اگرچہ تمھاری یہ خُود اعتمادی

تمھیں اِس مُسافت میں تھکنے نہ دے گی

مگر یاد رکھو

سفر کے لیے صرف چلنا ضروری نہیں ، اور دیکھو

ہَوا آج تک بے ٹھکانہ ہے ، لہریں

کناروں سے سر مار کر ٹوٹ جاتی ہیں، تارے
اَزل سے خُود اپنے گرفتار ہیں اور آنکھیں پرانے مناظر میں گُم ہیں۔
تمنّا ہمارے لیے شہرِ افسوں ہے جس کی فصیلوں، دریچوں، دروں
میں خیالوں کی پریاں کھُلے گیسوؤں سے گُزرتے ہُوئے رہروں کو
اشاروں سے اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں خُوں گرم جسموں میں
رُکتا ہے پاؤں اگر ٹھہر جائیں تو چلتے نہیں۔
بدن پتّھروں سے نکلتے نہیں۔
زندگی کا فسانہ بہت مُختصر ہے
کہیں یہ نہ ہو اِس کہانی کی تمہید ہی اِس کا انجام ہو،
اور سُنو جب تمنّا کے رستوں سے گزرو
تو آگے گئے قافلوں کی سبھی یادگاروں کی تعظیم کرنا
جہاں سے بھی گزرو نقوشِ کفِ پا کو محفوظ کرنا،
کہ لاکھوں یہاں بے نشاں پھر رہے ہیں
ہر اِک راہ پر رفتگاں پھر رہے ہیں

سُنو میری مانو

تمنّا کا حاصل فقط گمرہی ہے

چلو، ہم زمانے کا دامن پکڑ کر

یہ عُمرِ رواں کا سفر کاٹ ڈالیں

لَب و گوش پر خامشی کو سجائیں،

دریچوں میں آباد چہرے نہ دیکھیں

جہاں روشنی ہو نگاہیں بچالیں

رفاقت کے اس واہمے سے گزُریں

ہمیشہ بھٹکنے سے بہتر ہے ___ آؤ

جو کل ہونے والا ہے وہ آج کرلیں۔

۱۹
۵
۷۰

سوال

آسمانوں سے کوئی بشارت نہیں اور زمیں گُنگ ہے
وقت اِک بیوہ ماں کی طرح سوگ میں مبتلا ہے۔ ہَوا
سِسکیاں لے کے چلتی ہے کالی ہَوا
خواہشوں کے کنول دَرد کی جھیل سے سَر اُٹھاتے نہیں
خواب تک بند آنکھوں میں آتے نہیں۔

ساری سچّی کتابوں میں یہ درج ہے
ایسے حالات میں
آسماں سے نبی یا تباہی زمیں کی طرف
بھیجے جاتے رہے ہیں
مگر اِن کتابوں میں یہ بھی لِکھا ہے
نبی اب نہیں آئیں گے۔!

۲۱
۶
۷۰

دُھوم ہے پھر بہار آنے کی

میں نے چاہا اُسے بھول جاؤں

فراموش کر دُوں وہ سب

روز و شب!

اُس کو دیکھوں تو یوں جیسے واقف نہیں

میں بھی اُس کی طرح اَب کسی اور کو ساتھ لے کر چلوں

ہر گھڑی خُوش رہوں، مسکراتا پھروں،

بے وجہ بے سبب!

جب ہَوا کے قدم مثلِ مے نوش بے ڈھب سے پڑنے لگیں

چاندنی کھڑکیوں سے پُکارے، نگاہیں چمکنے لگیں!

آہٹیں کان میں شبنمِ سرگوشیاں کر کے چلنے لگیں

دستِ موسم کے اعجاز سے پیرہن — زرد پتّے بدلنے لگیں

بختِ خوابیدہ گُل آنکھ ملنے لگیں

کاش یُوں ہو کہ تب

اُس کو دیکھوں تو وہ اجنبی سا لگے،

اُس کی آہٹ پہ خواہش کے گُل نہ کِھلیں

وہ پُکارے اگر اُس کی آواز پر کان تک نہ دھروں،

عہدِ رفتہ کی ہر یاد کو بُھول کر آنے والی رُتوں کا سواگت کروں

اُس کے چہرے کو چہروں کے انبوہ میں اس طرح گُم کروں،

پھر وہ آنکھیں رہیں نہ وہ گیسو نہ لب،

میں نے چاہا اُسے بُھول جاؤں

فراموش کر دُوں وہ سب،

روز و شب!!

۸
۷
۷۰

دشتِ طلب

درِ طلسمِ صدا کھلے تو اُسے پُکاریں،
کہ اُس کے ہاتھوں میں خواہشوں کا قبول رد ہے،
اُسے دکھائیں کہ کتنے بادل
ہمارے کھیتوں سے بے تعلّق نکل گئے ہیں،
اُسے بتائیں کہ کتنی کلیاں
کشاد ہونے کی آرزو میں بکھر گئی ہیں۔
سنائیں اُس کو وہ لفظ جن کے
حروف بے صَوت ہو گئے ہیں
رُلائیں اُس کو اُن آنسوؤں پر
جو خشک آنکھوں میں کھو گئے ہیں
گلو گرفتہ اُداس لمحے، اُجاڑ صُورت بکھرتے موسم
وہ بختِ گریاں جو سو گئے ہیں۔

درِ طلسمِ صدا کھُلا تو عجب ہے منظر
چہار جانب ہجومِ خلقت ہے مثلِ لشکر
اُسی کی جانب رواں دواں ہیں
برہنہ پا و شکستہ رنگ و غبار برسر
سفید سائے ، سیاہ پیکر
لبوں پہ خواہش کے سبز جنگل، نظر سمندر
صدائیں اتنی ہیں ماند پڑتا ہے ، شورِ محشر
اُسے سُنائیں تو کیا سُنائیں !
کہ اپنی اپنی زباں میں سارے ہمارا قصّہ سُنا رہے ہیں ،
وہ جس کے ہاتھوں میں خواہشوں کا قبول رد تھا
ہر اِک کی آواز سُن رہا ہے ،
درِ طلسمِ صدا کھُلا ہے ،
کِسے پُکاریں ؟

۴
۸
۷۰

سُپردگی

اے متاعِ نظر،

میرا ہونا تری ذات سے اِس طرح منسلک ہے

کہ جیسے کسی سیپ کی آبرو اُس کے گوہر سے ہے

جیسے پرچھائیں کا ربط پیکر سے ہے

جس طرح رنگِ مے جام و ساغر سے ہے

مَیں اگر بولتا ہُوں تو تیرے سخن کی عنایت ہے یہ

میں اگر دیکھتا ہوں تو تیری نِگہ کی کرامت ہے یہ

میں اگر چُپ ہُوں تیری محبّت ہے یہ

میں سمندر نہیں

جو کناروں سے نکلوں تو آبادیوں میں قیامت مچے

میں مقدّر نہیں

جو بدلتا رہوں، بِن کہے، بِن سُنے،

میں نہیں تشنہ لب جو سرابوں کی آہٹ پہ چلتا رہوں

میں بگولہ نہیں جو ہَوا کے اشارے پہ اُڑتا پھروں

مَیں ترے شہر کے سنگدل راستوں کا ستایا ہُوا

اِک مُسافر ہُوں جس کی گرہ میں فقط آرزو ہے

نگاہوں میں تُو ہے،

میں ترے جانثاروں کے انبوہ سے ہوں ۔ ترے واسطے ہوں

تُو مجھے جانتا بھی نہ ہو تو تعجب نہیں

ہاں ترے واسطے تو مِرے ساتھ کے، سینکڑوں ہیں یہاں

خاک بر سر، پریشاں نظر، بے نشاں،

ناشناسی کی قاتل ہَوا سے بچیں کِس طرح اور جائیں کہاں،

اے تمنّائے جاں،

اجنبیّت کے اِس شہرِ گمنام میں، میں ترے نام کا ایک مصلُوب ہوں،

واپسی کے لیے کوئی رستہ نہیں ۔ تُو بھی ملتا نہیں

ہوں مبارک تجھے تیری کم گوئیاں ــــ تجھ کو ڈھونڈوں کہاں!

میرے احساسِ جاں کی نمو تجھ سے ہے'
میں اگر سیپ ہوں آبرو تجھ سے ہے
پُھول ہوں میں اگر رنگ و بُو تجھ سے ہے
اور اگر جسم ہوں تو لہُو تجھ سے ہے

۱۰
۹
۷۰

آخری خواب

مقدّروں کی سیہ عبارت کے لفظ قاہر ہیں اور ہم سب
کسی کی لکھی ہوئی کہانی میں اپنے کردار ڈھونڈتے ہیں
ہمارے خوابوں کی بے کرانی، تلاشِ معنی
کی سبز خواہش کے ایک نقطے سے پھوٹتی ہے
پکار بیتے ہوئے دِنوں کی اور آنے والی رُتوں کی آہٹ
ہر ایک منظر میں گونجتی ہے

کوئی تو ہوگا!
جو میری بے خواب سُرخ آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے
لرزتے ہونٹوں سے یہ کہے گا،
"بہت ہی اچھا تھا جانے والا"

۱۴
۱۰
۷۰

بے کسوں میں سرکشی کا حوصلہ آنے کو ہے

دوستو اُٹھو کہ وقتِ امتحانِ جسم و جاں ہے
وہ گھڑی سر پر کھڑی ہے
جو تمھاری اور میری آرزؤں سے بڑی ہے -
خواب کا لمحہ شکستِ خواب سے زیادہ گراں ہے ،
بُزدلی کی زیست مرگِ رائیگاں ہے ،
خواہشوں کی بند گلیوں میں ہَوا آنے کو ہے
اَن گِنت گونگی زبانوں میں نوا آنے کو ہے
آنسوؤں سے کور آنکھوں میں ضیا آنے کو ہے
ظُلم کی میعاد آخر ہو گئی ہے
بے کسوں میں سرکشی کا حوصلہ آنے کو ہے
دوستو آگے بڑھو ،

خُوشبوؤں، رنگوں، ہواؤں، موسموں کی راہ میں
خواب کے قریے میں پھیلی بستیوں کی راہ میں
منزلوں کی دُھن میں بڑھتے قافلوں کی راہ میں
جو بھی آتا ہے اُسے دشمن کہو ۔

ہو رہی ہے ایشیا میں ظُلم کے سُورج کی شام
اپنے خُوں کے ایک اِک قطرے کا لینا انتقام
جتنے ساتھی اس کشاکش میں مَرے ہیں (یا مریں گے)
اُن کی روحوں کو سلام

۱۶
۱۰
۷۰

فریبِ تماشا

کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے ،
وہ مجھ سے ہے بالکل ایسے ، جیسے پھُولوں سے خُوشبو ہے
یا پھر میں اُس سے ہُوں جیسے آنکھوں سے آنسو ہے
شاید ہم دونوں کا ہونا ان سب چیزوں کا ہونا ہے
یہ سب چیزیں ،
جن کے لیے جب تک ہم زندہ ہیں ہم کو رونا ہے ،
وقت اِک بگڑے بچّے سا ضدی ہے ، جس کے آگے
ہم دونوں کا ہونا ایک کھلونا ہے۔

جب وہ چلتا ہے تو میرے من میں آہٹ سی ہوتی ہے

جیسے وہ اِک رہبر ہے،

میں چلتا ہوں تو وہ میرے آگے پیچھے یوں چلتا ہے

جیسے میری راہ گزر ہے

راہگزر، جو خوابوں کی گمنام زمینوں کو جاتی ہے،

جیسے آپ مُسافر ہے!

کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے!

یہ جو ہمارے ہاتھ ہیں اِن سے بہتے دریا رُک سکتے ہیں،

پاؤں میں اِتنی طاقت ہے

ہم دشتِ فنا میں چل سکتے ہیں

آنکھوں میں منظر ہیں ایسے جن کو ابھی بننا ہے

اور رستے ہیں جن پہ ابھی چلنا ہے

اور جنگل ہیں جن میں دُشمن مخلوقوں سے لڑنا ہے،

اور کلیاں ہیں جن کو ابھی کھِلنا ہے،

سینے میں خواہش ہے،

خواہش ایسا اسمِ اعظم ہے جو سب بھیدوں کی کُنجی ہے،

جو ہونے کو انہونا، موتی کو کنکر، صدیوں کو لمحہ اور لمحے کو

صدیوں جیسا کر سکتا ہے،

ہونٹوں میں وہ جادُو ہے
جو پتّھر میں پھُول اُگا سکتا ہے تارے توڑ کے لا سکتا ہے،
جو پیارے ہم سے بچھڑ گئے ہیں اُن کو واپس لا سکتا ہے
جن کو ابھی آنا ہے اُن کے سُندر رنگ دِکھا سکتا ہے۔
جتنا کچھ میں جانتا ہُوں اور جس کا مُجھ کو علم نہیں، اور وہ جو مجھ سے ہے
یا میری آنکھوں سے اوجھل ہے،
اور وہ جو مجھ سے پہلے تھا اور وہ جو مستقبل ہے
لفظ ہی ان سب رازوں کا سینہ ہے،
جتنا کچھ میں کرتا ہوں یا کرتا تھا یا کرنے والا ہوں
لفظ اس کا تخمینہ ہے،
روشنی خوُد سُورج ہے یا سُورج کا حصّہ ہے (بہُت پرانا قصّہ ہے)
آؤ کالی رات کے دامن سے لپٹیں اور سو جائیں،
یہی ہمارا جینا ہے!

تیز ہوا کا پہلا جھونکا
اپنے پیچھے، پیلے پتّوں کی لاشوں کے ڈھیر لگاتا گزرا ہے

موسمِ گُل کا پہلا نغمہ

چاروں جانب پھُول کھِلاتا گُزرا ہے

پہلا بادل سرد دِلوں میں آگ لگاتا گُزرا ہے

لیکن میں اور وہ جو میرا جسم ہے اور جس کا میں سایہ ہوں یا، ....!

بے ہُنری کے بنجر ماہ و سال کے دُھندلے آئنوں میں وہ تعبیریں ڈھونڈ رہے ہیں

اب تک جن کے خواب ہماری آنکھوں سے بے گانہ ہیں،

اُن شہروں کی یاد میں گُم ہیں ازل سے جو ویرانہ ہیں۔

کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے،

یہ جو ہمارے ہاتھ ہیں ان کو ہم بس مَل سکتے ہیں

لاحاصل کا غم ہی ان کی دولت ہے

دشتِ فنا کو دیکھیں تو اُلٹے پھر جائیں۔ پاؤں میں اِتنی طاقت ہے

آنکھوں میں جالے سے تنے ہیں گرد آلو دخیالوں کے، اور رونے کی فرصت ہے

خواہش کی اوقات شکستہ، خواب کا زخم تازہ ہے،

بے ترتیبی ہستی ہے اور تارِ فنا شیرازہ ہے،

لفظِ سمندر کی دہشت ہے ساحل کا خمیازہ ہے،

شاید ہم دونوں کے سائے اُن سب چیزوں کے سوتے ہیں

جن کے لیے ہم جیتے ہیں اور جن کے لیے ہم روتے ہیں۔

۲۲
۱۱
۷۰

ایک تباہ شدہ جہاز کی کہانی

باش اے اہلِ سفر!
موج در موج بپھرتے ہوئے پانی نے کہا
ساحلوں پر جو ضمانت تھی، نکل چلنے کی
اب وہی رونقِ سیلاب بنی ہے ___ دیکھو
رزقِ گرداب بنی ہے ___ دیکھو
وہ جو گھر چھوڑ کے نکلے تھے نئے رستوں پر
ڈھونڈتے اپنی اُمیدوں کی زمیں
اَب کھڑے سوچتے ہیں
کس طرف جائیں، کسے پُوچھیں، کہاں پر ڈھونڈیں
وہ مُسافت کی ابیں،
صُورتِ وہم ہے ہر شکل یقیں
دامِ ہر موج میں منظر ہے نیا، خوفِ بے نام کے جادو سے رہا
ایک بھی آنکھ نہیں

کفِ سیلابِ بلا، کفِ لب ہائے دُعاگو کی طرح
دمبدم بڑھتا چلا جاتا ہے
آسمانوں کی طرف دیکھ کے سب روتے ہیں
تُو کہ ہر ایک کی سُنتا ہے کہاں ہے؟ — تو کہیں ہے کہ نہیں!!

"تم مجھے چھوڑ کے جاتے ہو کہاں — رُک جاؤ!
میں تمنّا ہُوں مِرا حرفِ مقدّر تم ہو!
جُوئے کم آب ہُوں میں اور سمندر تم ہو!
ہاں مری جان! مری جاں کے مسافر تم ہو!
آؤ بستی کی طرف جائیں وہاں پر ڈھونڈیں
کوئی چھت جس کے لیے
ہم تمنّا کے در و بام کی تعمیر کریں
اے سمندر کی ہَوا روک اسے — رُک اے مُسافرِ جاں کے،
اے ہوا روک اسے — روک اسے روک....."

"ہائے وہ لوگ تو مر جائیں گے
جو مری آس پہ جیتے ہیں جنھیں

اُس سمے میں نے کہا تھا دیکھو — مجھ کو ہنستے ہُوئے رُخصت کرنا
اے مِری آنکھ کے تارو، مِرے پیارے بچّو!
یہ بلاخیز ہوا، کالی مسافت کے عذاب
مجھ کو سہنا ہیں بہرطور کہ اِن سے آگے، وہ دُکانیں ہیں
جہاں سبز ہنسی مِلتی ہے،
وہ طرب خیز ہنسی
میں جسے ڈھونڈنے نِکلا ہوں تمھاری خاطر — !
اے مری جانِ سَفر، اِتنی مایوس نہ ہو
دیکھ نہ رو
میں بہت جلد چلا آؤں گا
ہاں مِری جان بہت جلد چلا آؤں گا
بھر کے دامن میں تُمھاری خوشیاں،
میری پیاری — خُوشیاں
(ہائے افسوس ہماری خُوشیاں)

"کیسا بھرپُور جواں تھا وہ شخص
اپنے ہی خون میں تر وہ مِرے پاس گرا تھا لیکن

اِتنی بے رنگ تھیں آنکھیں اُس کی

جیسے وہ خواب میں ہو!

نہ کہیں خوف کا سایہ تھا نہ نفرت کا نشاں

زندہ رہنے کی تمنّا تھی نہ مرنے کا گماں،

جیسے وہ مست مے ناب میں ہو

اُس نے ہولے سے کہا

یہ مجھے کون سمندر میں اُٹھا لایا ہے ؟

کیسا سیلاب مِری سمت بڑھا آتا ہے

پانی . . . . . پانی

کیا خبر موت سمندر کی طرح ہوتی ہو؟

"زندگی بھر کی کش کش کا صلہ

سنگِ مرمر سے بنائی ہُوئی لمبی کوٹھی

فیکٹری ــ کار ــ زمیں ــ داشتہ، جنسی امراض

کتنے خوش ہوں گے مِری موت پہ سارے بچّے !

میرے سگ زادے مرا خُون میرے پیارے بچّے !

کاش یہ چانس مجھے مِل جائے

سب کو میں عاق کروں، کام کروں نیکی کے
نام کر جاؤں کوئی فیض کے اسباب کروں،
جی میں ٹھانی ہے کہ بچ جاؤں تو مکّے کو چلوں"

. . . .

کوئی آواز نہیں
آسمان اور سمندر کی کڑی دہشت سے
بے خبر
ایک ٹوٹے ہُوئے تختے پہ بہا جاتا ہے
ایک ننّھا سا بشر
ساحلوں پر اسے کچُھ لوگ ملیں گے پھر یہ
آپ اِک روز سمندر کی طرف آئے گا
کون سے رُوپ میں، کب آئے
نہیں اس کو خبر
روزِ اوّل سے رواں — ابنِ آدم کا سفر۔

۲۷
۱
۷۱

جاگتی آنکھیں

چہروں سے بازار بھرے ہیں ـــ آوازوں سے گھر
پھر بھی خُون میں تیر رہا ہے ـــ اِک انجانا ڈر
خاموشی کے بام ہزاروں ـــ چُپ کے لاکھوں در
خواہش ایک تاریک مُسافت ـــ پتّھر ہی پتّھر

منظر کے آشوب سے نکلو ـــ سپنوں میں کھو جاؤ
اے شہرِ بیدار کے لوگو، تم بھی اَب سو جاؤ

۱۲
۲
۷۱

خواہشوں کی خاک پر

خواہشوں کی خاک پر قریہ بہ قریہ ، کُو بہ کُو
اپنے ہی نقشِ قدم ہیں رُو برُو
جب بھی دیکھا بے نمُو
خوابوں کے بننے ٹوٹنے کے درمیاں
آنکھ میں بکھرا ملا ہے ایک دشتِ رائیگاں'
بے ثمر ہر جستجو!
جو لکھا سو لوحِ قسمت کی طرح
اپنے ماتھوں پر لیے چلنا پڑا

راستے میں جسم و جاں کی آگ کا دریا بھی تھا
سنگدل حرفوں کی ٹھنڈی آنچ میں جلنا پڑا،
ہیں صدف پر ریت ہے اپنے گہُر کی آبرو

ان کہے لفظوں کی قاتل فوج میں
سب کے ہونٹوں پر ہنسی ہے سب کی آنکھوں میں حیا
"آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں خنجر کھُلا"
دشتِ جاں میں یوں رواں ہے دُشمنوں کا قافلہ
جیسے دریا موج میں
آئنے ہیں آئنوں سے دُو بدُو
کِس کے ہاتھوں پر گرا اپنا لہو!
ہم زمستاں کے مُسافر ہیں ہمہ تن برف ہیں
منجمد قطرے کی صُورت بادلوں کا ظرف ہیں
جو لبوں پر ہی ٹھٹھر کر رہ گئے وہ حرف ہیں
ہم ہَوا کا صَرف ہیں
مثلِ غبارِ آرزو!!
بھید اپنا کون جانے گا، دریچے بند ہیں،
سردمہری کے قفس میں

سب کے چہرے بند ہیں،
کس طرف جائیں کہ رستے بند ہیں۔
صوتِ گنبد کی طرح چکرا رہے ہیں چار سُو
آپ اپنی قید میں ہیں، کون ساتھی - ! کیا عدو!
خواہشوں کی خاک پر قریہ بہ قریہ ، کُو بہ کُو
اپنے ہی نقشِ قدم ہیں رُوبرُو

۲۴
۲
۷۱

ایک لڑکی

گلاب چہرے پہ مُسکراہٹ
چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبے
وہ جب بھی کالج کی سیڑھیوں سے
سہیلیوں کو لیے اُترتی
تو ایسے لگتا تھا جیسے دِل میں اُتر رہی ہو،
کچھ اس تیقّن سے بات کرتی تھی جیسے دُنیا،
اُسی کی آنکھوں سے دیکھتی ہو،
وہ اپنے رستے میں دل بچھاتی ہُوئی نگاہوں سے ہنس کے کہتی،
"تمھارے جیسے بہت سے لڑکوں سے میں یہ باتیں
بہت سے برسوں سے سُن رہی ہوں،
میں ساحلوں کی ہوا ہُوں نیلے سمندروں کے لیے بنی ہوں۔

وہ ساحلوں کی ہوا سی لڑکی
جو راہ چلتی تو ایسے لگتا تھا جیسے دِل میں اُتر رہی ہو
وہ کل ملی تو اِسی طرح تھی۔
چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبے، گلاب چہرے پہ مسکراہٹ
کہ جیسے چاندی پگھل رہی ہو،
مگر جو بولی تو اُس کے لہجے میں وہ تھکن تھی
کہ جیسے صدیوں سے دشتِ ظُلمت میں چل رہی ہو۔

۱۶
۴
۷۱

دل اِک خواب نگر ہے

دل اِک خواب نگر ہے جس میں لمحہ لمحہ
اُس کے سپنے ، بند آنکھوں میں نئے دریچے وا کرتے ہیں ۔
ہر چہرے میں اُس کا چہرہ رکھ دیتے ہیں ۔
میرے اُس کے بیچ ہزاروں دیواریں ہیں
رسموں اور رواجوں کی
بیگانوں کی قاتل نظروں اور اپنوں کی باتوں کی
اُس کی بے پروائی کی اور اپنی پاگل سوچوں کی
کالی، دشمن راہوں کی ۔

میں اِس ظالم ، اندھی اور منہ زور فضا میں اِک بے مایہ ذرّہ تھا
جو اپنے سے لاکھوں میں گُم تھا
اُس کے خواب نے میری آنکھیں روشن کی ہیں
خاموشی میں جادُو ہے تو پھر وہ جادوگر ہے!
اُس کی چُپ نے میرے دل کو نطق دیا ہے'
میں قطرہ تھا اُس کی ذات سمندر ہے !
اُس کی محبّت نے مجھ کو تخلیق کیا ہے ،

ارمانوں کی بانجھ ہَوائیں
آنکھوں کے گُمنام جزیروں میں چلتی ہیں
اور خواہش کے خشک درختوں کی شاخوں میں
سائیں سائیں کرتی ہیں
موسم آنکھیں پھیر کے دل کے دُرد نگر سے چل دیتے ہیں
بادل ویرانے پہ گِھر کر بن برسے چل دیتے ہیں
اُس کے بنا آواز کی کرنیں — آنکھیں — پھُول ، ستارے ، پتّھر
دل اِک شہرِ سنگ ہے جس میں گلیاں ، باغ ، منارے' پتّھر
خواہش جادو کی بستی ہے ، مُڑ کے دیکھو' سارے پتّھر
دریاؤں کے دھارے پتّھر!

وہ آئے تو پتّھر کو آواز ملے
شہرِ سنگ کے دروازوں کو وا کرنے کا راز ملے
دل اِک خواب نگر ہے اِس کے، خوابوں کو آغاز ملے۔

اے وطن کی ہَوا

اے وطن کی ہَوا

ہم ابھی ننھے مُنّے سے معصوم بچّے تھے جب ایک دِن

تو اِنھی آنگنوں، روزنوں، چلمنوں، وادیوں، پربتوں

بستیوں اور جزیروں کی تقدیریں

روشنی کے پھریرے اُڑاتی ہُوئی آئی تھی اور ہم

جن کے کانوں نے ماں کی سُبک لوریوں کے سوا کچھ سُنا ہی نہ تھا

جوش انگیز نعروں کی آواز پر مُسکرانے لگے تھے

کہ اس میں سماعت کو راحت ملی تھی، وہی نغمگی

بچپنے سے جوانی کے ہر موڑ تک مثلِ موجِ نفس

ساتھ چلتی رہی۔

اے وطن کی ہَوا

تیری خوشبو ہمیں سحر کی مثل ہے جس میں ہم بند ہیں

ہم جہاں بھی رہیں تیرے پابند ہیں

ہم میں کتنے ہیں جو تیری خوشبو کی میٹھی مدھر تان پر
اپنا سب کچھ گنوا کر تری سمت بازو کشادہ چلے
اور کتنے ہیں جو تیرا رستہ بتانے کی پاداش میں ظلم سہتے رہے،
اور کتنے ہیں جو آنکھ کھلنے سے اب تک تجھی میں پلے،
پر سبھی ایک دُوجے کے مانند ہیں۔

اے وطن کی ہَوا
تیری رفتار کے سینکڑوں رنگ ہیں
ہم نے دیکھا تجھے،
سرفروشوں کے پہلو میں لڑتے ہُوئے
سرحدوں کی طرف آگے بڑھتے ہُوئے
شہر و دیہات کے ہر در و بام پر جگمگاتے ہُوئے
دُشمنوں کی طرف سنسناتے ہُوئے

ہم نے دیکھا تجھے
خوف و دہشت سے پُر سرد تاریک سڑکوں پہ چلتے ہُوئے
بے خطر گرم آنکھوں میں پَلتے ہُوئے
ہم نے دیکھا تجھے

اشک آور کیسلے دھوئیں میں لپٹ کر چمکتی نگاہوں سے بہتے ہُوئے
قِصّۂ خونِ مظلوم کہتے ہُوئے

ہم نے دیکھا تجھے
شہر در شہر زندانیوں کے لیے بَین کرتے ہُوئے
قصرِ سلطان کے آہنی گیٹ . سے سر پٹکتے ہُوئے

اے وطن کی ہَوا
تیری رفتار کے سینکڑوں رنگ ہیں
ہم مگر دنگ ہیں،
کہ ترا راستہ تو وفا کے گلستان، اخوّت کی گلیوں،
یقیں اور محبّت کی گلپوش راہوں، چمکتی پناہوں
کی جانب چلا تھا مگر تُو ہمیں کون سی
وادیٔ خار میں لے کے پھرتی رہی،
شیشۂ چشم پر ہر طرف زنگ ہیں،
ہم تجھے اپنے بے سمت، کالے سفر کی کتھا کیا سُنائیں،
تجھے سب خبر ہے تجھے کیا بتائیں

روزِ آغاز سے ہم ترے سنگ ہیں
منزلِ بے جہت کا اَلم ہے وہی
اور غم کے وہی زرد فرسنگ ہیں

اے وَطن کی ہَوا

آج کا دن ترا روزِ آغاز ہے

اے ہماری مسافت کے آغاز و انجام سے آشنا

منزلوں کی جبینوں سے پردہ اُٹھا

لوریوں اور نعروں کی تفریق سے بے خبر، جب ابھی ننّھے مُنّے سے

معصوم بچّے تھے ہم

اُس زمانے کی خُوشبو کا نغمہ سُنا،

پھر وہ ماں سا مقدّس، محبّت بھرا نرم چہرہ دکھا

اے وطن کی ہَوا۔ اے وطن کی ہَوا

۲۸

۷

۷۱

چھ ستمبر

چھ برس پہلے اسی روز انہی گلیوں میں
خُون کا رنگ لیے
موسمِ جنگ لیے
سنسناتی ہُوئی بے چین ہوا آئی تھی ،
چھ برس پہلے اسی روز انہی کانوں میں ،
سرفروشوں کے ارادے لے کر
قریۂ سبز کے جادے لے کر
جرأت و عزم کے نغموں کی صدا آئی تھی ،
چھ برس پہلے اِسی روز انہی آنکھوں میں
خوابِ دہشت کی فصیلیں ٹوٹیں
سینکڑوں رنگ شعاعیں پھُوٹیں

اور بے برگ درختوں میں صبا آئی تھی ،
چھ برس پہلے اسی روز انہی کھیتوں میں
جلتے سُورج کی تمازت کا مداوا کرنے
خاکِ بے آب کو تازہ کرنے
شوقِ اظہار لیے سبز گھٹا آئی تھی،

چھ برس پہلے اسی روز مرے چار طرف، ایک ریوڑ کی طرح
چلتی ہُوئی بھیڑ رُکی اور بے نام سرابوں میں گھری آنکھ کو بینائی ملی،
دل کے دریائے تنک آب میں اِک موج اُٹھی،
میرے اطراف میں پھیلی ہُوئی خالی آنکھیں، بے ہُنر ہاتھ، لبِ خشک
گریزاں پاؤں
اور کندھوں کے شکنجوں میں لٹکتے بازو ،
بے اماں تیز ہواؤں کی نوائیں سُن کر پیکرِ آدمِ خاکی میں ڈھلے
قافلے دل کے چلے،

چھ برس بعد وہی دن ہے وہی شہر ہے گلیاں ہیں وہی،
گلشنِ خوف وہی درد کی کلیاں ہیں وہی

میں ہواؤں کی گزرگاہ میں آنکھیں میچے
اپنی پہچان بھلائے ہُوئے لوگوں کا سفر دیکھتا ہوں،
اپنے اطراف میں ریوڑ کی طرح
بے خبر بھیڑ کے قدموں کی دھمک سُنتا ہُوں،
بے ہُنر ہاتھ، لبِ خشک، گریزاں پاؤں
اور کندھوں کے شکنجوں میں لٹکتے بازو
مُجھ سے کہتے ہیں اُٹھو،
شہر در شہر چراغاں کر کے فتح کا جشن کریں
جنگ کی سال گرہ کا دن ہے آؤ ہم رقص کریں۔

چھ برس پہلے اسی روز انہی گلیوں میں
خُون کا رنگ لیے
موسمِ جنگ لیے
سنسناتی ہُوئی بے چین ہوا آئی تھی

۲۳
۸
۷۱

اِعلان

تمام دُنیا میں جتنے ظالم جہاں جہاں ہیں اُنھیں بتا دو،
کہ نسلِ آدم کی جتنی ذلّت تھی اُن کے بس میں وہ کر چُکے ہیں
جو اُن کی پلکوں کی جنبشوں میں حیات پاتے تھے مر چُکے ہیں،

یہی اُفق تھے کہ جن میں صدیوں سے کوئی سُورج
نہیں اُگا تھا
یہی زمینیں تھیں جن کا جوبن
پرائے لوگوں میں بٹ رہا تھا
یہی وہ گمنام دُلہنیں تھیں کہ جن کے ماتھوں
پہ کوئی جھومر نہیں سجا تھا
انھیں بتا دو اُداس نسلوں کے خواب رستے نکھر چُکے ہیں۔

سیاہیوں کے عقب سے پھوٹی ہے روشنی کی اُمید آخر،
قفس نشینوں کو مِل رہی ہے رہائیوں کی نوید آخر،
گلاب جسموں سے ہونے والی ہے اب ہوس کی کشید آخر،
اُنھیں بتا دو کہ تشنہ کاموں کے صبر پیمانے بھر چکے ہیں۔

جو اپنے ہونے سے منفعل تھے
سروں کو تانے ہُوئے کھڑے ہیں
نواحِ ظُلمت میں قریہ قریہ
نئی سحر کے عَلم گڑے ہیں
غبار آسا جو منتشر تھے
مثالِ کوہِ گراں اَڑے ہیں
اُنھیں بتا دو کھُلے فلک سے غلام سُورج گزر چکے ہیں!
تمام دُنیا میں جتنے ظالم جہاں جہاں ہیں اُنھیں بتا دو
جو اُن کی پلکوں کی جنبشوں میں حیات پاتے تھے مر چکے ہیں۔

۱۳
۹
۷۱

وطن کی مٹّی پُکارتی ہے

ہوائے سرحد ہمارے شہروں کی سمت آئی تو اُس کے ہونٹوں پہ یہ نوا تھی ۔

"مجاہدوں کو نوید پہنچے
کہ آزمائش کی جس گھڑی کے وہ منتظر تھے ___ وہ آگئی ہے
صدا وطن کی ہر ایک سرحد پہ گونجتی ہے
اُٹھو کہ تم کو وطن کی مٹّی پُکارتی ہے!"

ہر ایک لب پر یہی صدا تھی،
وطن بُلائے تو سوچنے کا مقام کیا ہے ؟
چلو کہ سرحد پہ اپنے خُوں سے لکھیں شجاعت کی داستانیں،
چلو کہ فانی کو غیرفانی میں ڈھالنے کا کمال جانیں

ہمیں وطن کی گلاب مٹّی کا ایک ذرّہ تمام دُنیا کے مال و زر سے عزیز تر ہے!
اس ایک ذرّے میں آٹھ صدیوں کی داستانیں لکھی ہُوئی ہیں، یہ داستانیں ہمارے خُوں کے ہر ایک قطرے میں موجزن ہیں ۔

اُٹھو کہ ماضی کی داستانوں کو اپنے تازہ لہو سے سینچیں،
کہ آنے والے دِنوں کی فصلوں کے بیج بونے کا وقت آیا؛
جو آج بوئیں گے کل اُسی کو ہی کاٹنا ہے
کہ جو بھی لمحہ گزر رہا ہے
وہ آگے گزرے چراغ لمحوں اور آنے والے فراغ لمحوں میں رابطہ ہے!

پُکارتے ہیں دروں، دریچوں سے آبرو کے بہار موسم
گلاب بونے کی رُت نہیں ہے کہ ہم کو اپنے
گھروں میں کھلتے گلاب بچّوں کو پالنا ہے
کہ ماؤں بہنوں کے پھُول چہروں اور اپنی معصوم بیٹیوں کے
لبوں پہ کھلتے ہُوئے شگوفوں کو سرحدوں کی طرف سے بڑھتی سیہ ہَواؤں
کے تیز حملوں کی زد میں آنے سے روکنا ہے
سروں کو ہاتھوں میں لے کے نِکلو
کہ آنے والے دِنوں میں عزّت اور آبرو کا نشاں یہی ہے
وطن کی مٹی ہماری ماں کا سفید آنچل ہے
جس کی حُرمت ہماری ہستی سے معتبر ہے
وطن کے رستے میں جو سپر ہو وہ سینہ ہم کو عزیز تر ہے
جہاں پہ منزل ہے آبرو کی وہیں ہماری بھی رہ گزر ہے

خمِ شہادت میں آبِ حیواں چھلک رہا ہے؛

ہمیں خبر ہے!

پُکارتی ہے زمینِ سرحد،
"عظیم ہے گو وفا کی منزل، عظیم تر ہیں وہ پاؤں جن کو
صدا وطن کی ہمارے دامن میں لے کے آئی،
عظیم تر ہے وہ سبز خواہش
جو شوق رشتوں کی اُستواری کی سُرخ مٹی سے پُھوٹتی ہے۔
عظیم تر ہے وہ سانس جس کی عزیز ڈوری
وطن کے رستے میں ٹوٹتی ہے"۔

۶
۱۲
۷۱

شکستِ انا

آج کی رات بہت سرد بہت کالی ہے
تیرگی ایسے لپٹتی ہے ہوائے غم سے
اپنے بچھڑے ہوئے ساجن سے ملی ہے جیسے
مشعلِ خواب کچھ اس طور بجھی ہے جیسے
درد نے جاگتی آنکھوں کی چمک کھالی ہے،
شوق کا نام نہ خواہش کا نشاں ہے کوئی
برف کی سِل نے مرے دل کی جگہ پالی ہے
اب دُھند لکے بھی نہیں زینتِ چشمِ بے خواب
آس کا رُوپ محل، دستِ تہی ہے جیسے!
بحرِ امکان پہ کائی سی جمی ہے جیسے!
ایسے لگتا ہے کہ جیسے میرا معمورۂ جاں
کسی سیلاب زدہ گھر کی زبوں حالی ہے۔

نہ کوئی دوست نہ تارا کہ جسے بتلاؤں!
اس طرح ٹوٹ کے بکھرا ہے اَنا کا شیشہ
میرا پندار مِرے دل کے لیے گالی ہے،
نبضِ تاروں کی طرح ڈُوب رہی ہے جیسے!
غم کی پہنائی سمندر سے بڑی ہے جیسے!
آنکھ صحراؤں کے دامن کی طرح خالی ہے،
وحشتِ جاں کی طرف دیکھ کے یوں لگتا ہے،
موت اس طرح کے جینے سے بھلی ہے جیسے!
تیرگی چھٹنے لگی، وقت رُکے گا کیوں کر،
صبحِ خورشید لیے در پہ کھڑی ہے جیسے،
داغِ رُسوائی چھپائے سے نہیں چھپ سکتا
یہ تو یوں ہے کہ جبیں بول رہی ہے جیسے!

۱۷
۱۲
۷۱

فریب خوردہ نسل کا عہد نامہ

ہم گنہگار ہیں،

اے زمینِ وطن ہم گنہگار ہیں

ہم نے نظموں میں تیرے چمکتے ہُوئے بام و دَر کے جہاں تاب قصّے لکھے،

پھُول چہروں پہ شبنم سی غزلیں کہیں، خواب آنکھوں کے خُوشبو قصیدے لکھے،

تیرے کھیتوں کی فصلوں کو سونا گنا، تیری گلیوں میں دِل کے جریدے لکھے

جن کو خُود اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں ہم نے تیری جبیں پر وہ لمحے لکھے،

جو تصوّر کے لشکر میں لڑتے رہے

ہم وہ سالار ہیں،

اے زمینِ وطن ہم گنہگار ہیں

جاگتی آنکھ سے خواب دیکھے اُنھیں اپنی مرضی کی تعبیر دیتے رہے

ہم ترے بارور موسموں کے لیے بادِ صرصر میں تاثیر دیتے رہے

ہم اندھیرے مناظر کو روشن دنوں کی اُمیدوں سے تنویر دیتے رہے
تیرے ساحل کی آزادیوں کے لیے ہم تلاطم کو زنجیر دیتے رہے
جو ہمیشہ تجھے آرزو کے جھروکے سے تکتے رہے
ہم وہ فن کار ہیں۔

اے زمینِ وطن ہم گنہگار ہیں
اے زمینِ وطن ہم گنہگار ہیں، ہم ترے دُکھ سمندر سے غافل رہے
تیرے چہرے کی رونق دُھواں ہو گئی ہم رہینِ حدیثِ غمِ دل رہے
ظلم کے رُوبرُو لب کشائی نہ کی اِس طرح ظالموں میں بھی شامل رہے
حشر آور دنوں میں جو سوئے رہے،
ہم وہ بیدار ہیں۔
اے زمینِ وطن ہم گنہگار ہیں۔
جب ترے زرد پڑتے ہُوئے موسموں کو مہکتی شفق کی ضرورت پڑی
ہم نے اپنا لہو آزمایا نہیں
تیری خُوشبو سکوں کی تمنا لیے آندھیوں کے جلو میں بھٹکتی رہی
ہم نے روکا نہیں
تیری مٹی نگاہوں میں بادل لیے خشک موسم کے رستے میں بیٹھی رہی
ہم نے دل کو سمندر بنایا نہیں،

تیری عزّت زمانے کے بازار میں دل جلاتی ہُوئی بولیوں پہ بِکی
ہم نے کانوں میں سیسہ اُتارا نہیں

ہم گُنہگار ہیں ۔
اے زمینِ وطن تجھ کو تو علم ہے لوگ کیوں گردِ راہِ ملامت ہُوئے
جن محافظ نما دُشمنوں کے عَلم تیرے روشن لہُو کی شہادت ہُوئے
ہم بھی اُن کی سیاست کے نخچیر ہیں آستینوں کے جو سانپ ثابت ہُوئے
ہم بھی تیری طرح سازشوں کی ہَوا
کے گرفتار ہیں ؎

ہم گنہگار ہیں ـــــ
ہم گنہگار ہیں اے زمینِ وطن پر قسم ہے ہمیں اپنے اجداد کی
سرحدوں سے بُلاتے ہوئے خوُن کی، اپنی بہنوں کی حُرمت کی ' اولاد کی
ہاں قسم ہے ہمیں آنے والے دِنوں کی اور آنکھوں میں ٹھہری ہُوئی یاد کی
اَب محافظ نما دشمنوں کے علَم
اُن کے کالے لہُو سے بھگوئیں گے ہم
تیرے دامن پہ رُسوائیوں کے نشاں
آنسوؤں کے سمندر سے دھوئیں گے ہم
آخری مرتبہ اے متاعِ نظر
آج اپنے گناہوں پہ روئیں گے ہم

تیری آنکھوں میں اب اے نگارِ وطن
شرمساری کے آنسو نہیں آئیں گے
ہم کو تیری قسم اے بہارِ وطن
اب اندھیرے سفر کو نہ دوہرائیں گے
گر کسی نے ترے ساتھ دھوکہ کیا تو وہ کوئی بھی ہو
اُس کے رستے میں دیوار بن جائیں گے
جان دے کر ترا نام کر جائیں گے

۳۰
۱۲
۷۱

نئی نسل کا نوحہ

میں سوچتا ہوں،

لکھا ہے جو کُچھ پڑھا ہے جو کُچھ، وہ کس لیے تھا

کہاں سے پُوچھوں!

وہ کِس لیے ہے کیسے بتاؤں!

مجُھے عقیدوں کے خواب دے کر کہا گیا ان میں روشنی ہے

چمکتی قدروں کی چھب دکھا کر مجُھے بتایا یہ زندگی ہے

سِکھائے مجُھ کو کمال ایسے

یقیں نہ لائیں سِکھانے والے اگر اُنھیں کو میں جا سُناؤں

میں کہنہ آنکھوں کی دسترس میں نئے مناظر کہاں سے لاؤں

کہاں پہ جنسِ کمال رکھوں۔ خیالِ تازہ کہاں سجاؤں

زمین پاؤں تلے نہیں ہے تو کیسے تاروں کی سمت جاؤں

پُرانی قدریں جو محترم ہیں
اُنھیں سنبھالوں یا آنے والے نئے عقیدوں کا بھید پاؤں

وہ سب عقیدے تمام قدریں خیال سارے
جو مجھ کو سکّے بنا کے بخشے گئے تھے میرے حواسِ خمسہ سے معتبر تھے
جب اُن کو رہبر بنا کے نکلا
تو میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں میں کچھ نہیں ہے
میں ایسے بازار میں کھڑا ہوں جہاں کرنسی بدل چکی ہے

سلام تجھ کو طلوعِ فردا

اسی زمیں سے نمود میری اِسی زمیں پر حساب میرا ،
میں پچھلی نسلوں کا خواب بن کر گزرتے لمحوں میں جاگتا ہوں ،
میں آنے والے دنوں کی آہٹ ہوں، اُن زمانوں کو دیکھتا ہوں ،
جو سارے سینوں میں خواہشوں کے لباس پہنے اُبھر رہے ہیں
میں آنے والی رُتوں کے دامن میں ایسے پھولوں کو سُونگھتا ہُوں
ابھی تلک جو کِھلے نہیں ہیں
میں ایسے الفاظ سُن رہا ہوں جنھیں مطالب مِلے نہیں ہیں
خزاں میں پھُوٹی ہیں میری کلیاں، اُگا ہے خوں میں گلاب میرا
اِسی زمیں سے نمود میری، اِسی زمیں پر حساب میرا

ستم رسیدوں کی بستی بستی ہوا کے رَستے میں اپنے موسم کی منتظر ہے
یہ بے کسی کا طویل صحرا سکوں کی منزل سے بے خبر ہے

کنارِ دریا جو مر رہا ہے یہ وہ شہیدوں کا کارواں ہے
حیاتِ انساں شکم کے دوزخ کو بھرتے رہنے کی جستجو میں
بھٹکتے رہنے کی داستاں ہے،
یہاں دُکھوں کے مہیب سائے دروں، دریچوں میں اس طرح سے
جمے کھڑے ہیں کہ لاکھ سُورج اُبھر کے ڈُوبے
گھروں کے آنگن کرن کرن کو ترس رہے ہیں
مکان ایسے کھڑے ہیں جیسے گزُرنے والوں پہ ہنس رہے ہیں
یہ وہ خرابے ہیں جن میں صدیوں سے لاکھوں انسان بَس رہے ہیں
یہ وہ زمینیں ہیں جن کی قسمت میں خشک سالی لکھی گئی ہے
اگرچہ آنسو اُمنڈ رہے ہیں، اگرچہ بادل برس رہے ہیں
اُداس لمحے کچُھ اس طرح سے گزُر رہے ہیں
کہ جیسے کوئی جوان بیٹے کو دفن کر کے پلٹ رہا ہو
عجیب گنبد کی سی فضا ہے مری صدا ہے جواب میرا
اِسی زمیں سے نمود میری، اسی زمیں پر حساب میرا

ستم رسیدوں کی بستیوں کو مری طرف سے نوید پہنچے
اُبھرنے والا ہے اب وطن کی زمیں سے ہی آفتاب میرا

کہ میری آنکھوں پہ اُن کے فردا کا حال ظاہر ہے
میں نے دیکھا ہے وہ شکم کے عظیم دوزخ کو بھرتے رہنے کی
داستاں کو بدل رہے ہیں
کرن کرن جو ترس رہے تھے اب اُن دریچوں سے دُکھ کے سایوں
کو قتل کر کے ضیا کے لشکر نکل رہے ہیں
میں بادلوں کی نمی ہواؤں کے خشک جھونکوں میں چھوڑ رہا ہُوں ،
میں جانتا ہوں اَب ان زمینوں پہ آنے والے ہیں ایسے موسم
جو خواب جیسے حسیں ہیں لیکن حقیقتوں کے لباس میں ہیں ،
مری طرف سے ستم رسیدوں کی بستیوں کو نوید پہنچے
کہ آنے والے دنوں کے دامن میں اُن کی خُوشیاں بسی ہُوئی ہیں
میں اُن کو مژدہ سُنا رہا ہُوں
کہ اُن کے قصّے کا ہی تسلسل ہے باب میرا
گلاب بن کر مہکنے والا اب زمانے میں خواب میرا
سلام تجھ کو طلوعِ فردا ، ہراولِ انقلاب میرا
اسی زمیں سے نمود میری ، اسی زمیں پر حساب میرا

۲۸
۲
۷۲

ایک اجنبی سفر

یہ ریل گاڑی
جو جانے بُوجھے ہُوئے سفر پر رواں دواں ہے
اسے پتہ ہے کہ اس کی منزل اسی سفر میں کہیں نہاں ہے
یہ اپنے رستے پہ گامزن ہے
اور اس میں بیٹھے ہوئے مُسافر بھی اپنے رستوں پہ جا رہے ہیں ،
عجیب قِصّہ ہے ، ایک گاڑی کے سب مُسافر ہیں
پھر بھی اپنی جگہ پہ ہر ایک کارواں ہے

میں اپنی کھڑکی سے لگ کے بیٹھا ، گزُرتے پیڑوں کو
سبز کھیتوں میں کام کرتے ہُوئے کسانوں کو ، جوہڑوں کو
بھرے ہُوئے اور خشک نالوں کو ، بادلوں کو
مویشیوں اور پاس آتے ہُوئے سٹیشن کے سُرخ سگنل کو دیکھتا ہُوں
یہی مناظر ہر ایک کھڑکی سے لگ کے بیٹھے ہُوئے مُسافر کے واسطے ہیں
اگر وہ دیکھے !

میں چاند جیتتے ہُوئے زمانے کا آدمی ہُوں
مگر میں اُن میں نہیں ہُوں جن کے قدم خلاؤں کو چھُو کے آئے
(ہم اپنی دُنیا کے آدمی ہیں مگر یہ دُنیا "ہماری دُنیا" سے مختلف ہے)
عجیب قِصّہ ہے
اپنے ہونے کو جانتے ہیں پر اجنبی ہیں
اُسی طرح جیسے گِرد بیٹھے ہُوئے مُسافر، مِرے سفر کے شریک بھی ہیں
پر اجنبی ہیں
یہ اجنبیّت کا زرد نقطہ جو میری آنکھوں سے گِرد بیٹھے ہُوؤں
کی آنکھوں میں پھیلتا ہے ___ وہ دائرہ ہے
جو میرے ڈبّے سے ریل گاڑی کے باقی ڈبّوں
وہاں سے میرے اُداس گھر تک، وہاں سے شہروں، صغیر قوموں
کبیر مُلکوں، فلک کی بے نام وسعتوں تک چلا گیا ہے،
کوئی نہیں جو مجھے بتائے
میں اجنبیّت کے دائرے میں کہاں کھڑا ہُوں ؟

۱۳
۴
۷۲

مکالمہ

کون ہو اجنبی !
کس لیے ایسی بے ہُودہ دستک سے اہلِ محلہ کی راحت بھری نیند کو
مُنتشر کر رہے ہو
رات کا تیسرا پہر طبیّ حوالے سے سونے کا موزوں تریں وقت ہے،
تم کہاں پھر رہے ہو !

کیا کہا تم مُجھے جانتے ہو، مگر اجنبی . . . .

. . . .
بھائی، جب میں تمھیں جانتا ہی نہیں تو سوا اجنبی کے بھلا کیا کہوں !

. . . .
بہت خُوب، تم بھی وہی نام رکھتے ہو جس کے وسیلے سے اہلِ محلہ
مُجھے جانتے ہیں، مگر اجنبی

میں تمھیں اجنبی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا ___ !
غالباً تم ابھی تازہ وارد ہو اور شہر کے گیٹ پر درج اعلان بھی تم نے
دیکھا نہیں

بحث کرنے کی مہلت نہیں اجنبی، بھاگ جاؤ ابھی
اور جب تک مری موت کی اطلاع نہ ملے، شہر سے دُور رہنا،
اس جگہ کوئی شے دُوسری چیز کے متماثل نہیں ___

۱۱
۴
۷۲

جُدائی کی پانچویں سالگرہ

جی میں ہے آج کی شب اُس کے لیے جاگ کے کاٹی جائے ،
وہ جو آنکھوں سے پرے
اجنبی دیس کی گمنام ہواؤں میں کہیں بیٹھی ہے ،
کیا محبت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مَیں
اُس کے چہرے کو خدوخال میں لاکر دیکھوں ،
سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد نہیں ، اُس کی جبیں کیسی تھی ؟
ہونٹ کیسے تھے ، بدن کیسا تھا ، آنکھیں کیا تھیں !
بس یہی یاد ہے وہ جیسی نظر آتی تھی
اُس سے کہیں اچھّی تھی

(یہ مہ و سال کا طوفان بہت ظالم ہے
وہ اگر پاس بھی ہوتی تو کسے علم ہے کیسی ہوتی !)

یوں تو ہر رات مرے دِل پہ گراں کٹتی ہے
پھر بھی اے بھُولے ہُوئے ، تُو ہی بتا
غم کی زنجیر بھلا
جاگنے ، سوچتے رہنے سے کہاں کٹتی ہے !
یہ جو آہٹ سی ابھی نکہتِ گُل کی طرح پھیلی ہے
تیرے قدموں کی صدا لگتی ہے
جب کبھی کوئی جہازِ یاد کی شمع لیے غم کی بے چین ہواؤں سے گزرتا ہے تو دِل
شامِ فرقت کے تصوّر سے لرز اُٹھتا ہے
شامِ فرقت ! جو حقیقت ہے مگر خواب نما لگتی ہے
چاند جب اَبر کے ٹکڑوں میں سَفر کرتا ہے تو یوں لگتا ہے
میں بھی اِک اَبر کا ٹکڑا ہوں جسے تیرا وصال
ایک لمحے کی رفاقت میں ملا ،
اے مِرے گزرے ہُوئے چاند ! مجھے تیرا وصال
تیرا ایک لمحہ وصال
دائمی ہجر کے اندوہِ مسلسل کے عوض بار نہیں !
اے مجھے ابر کے ٹکڑے کی طرح چھوڑ کے جانے والے
تیرے بخشے ہُوئے لمحے کے عوض
کیا مجھے دینا پڑا ، اس سے سروکار نہیں ۔

پانچویں سال گرہ آج جُدائی کی مناؤں شب بھر
شامِ فرقت کی طرح ، اَشک بہاؤں شب بھر
پھر ائرپورٹ کی ریلنگ پہ ٹکا کر کہنی
تیری رُخصت کا سماں، دھیان میں لاؤں شب بھر
تُو جو روتی ہُوئی آنکھوں سے پرے
اجنبی دیس کی گُمنام ہَواؤں میں کہیں بیٹھی ہے۔

۱۹
۵
۷۲

زمیں پیاسی ہے

بِلکتے بچّے کی ایڑی سے تا بہ دَشتِ فرات
حدیثِ تشنہ لباں سو طرح سے نِکلی ہے
ہوس سے چُور زمیں کے خمارِ خواہش میں
ہزار برف قبا چوٹیاں پگھلتی ہیں
میانِ سنگِ گراں، اپنی سردِ کاہش میں
سُکڑتی، پھیلتی نہروں کے جال بُنتی ہیں
یہ ناچتے ہُوئے جھرنے یہ بولتے چشمے
سمندروں کا زمیں سے عظیم پھیلاؤ!

یہ بادلوں کی سواروں میں بھاگتے قطرے
وہ کائنات کی وسعت ہو یا کہ نقطۂ ذات
ہر ایک رنگ میں پانی کی فصل اُگتی ہے

نگر نگر میں رواں خُون ہے تمنّا کا
لہو لہان ہیں بچّوں کی سبز چہکاریں
فضا میں کوند رہی ہیں ہوس کی تلواریں
لہُو کی کوکھ سے پھُوٹا ہے تخُم دُنیا کا ،
وہ ایشیا کی زمیں ہو کہ ارضِ افریقہ
ہمارے خُون سے روشن ہیں ظالموں کے چراغ
لہُو کی بزم جمی ہے ، چھلک رہے ہیں ایاغ
غمِ حیات کے دریا سے تا بہ دشتِ ممات
لہُو ترنگ ہواؤں کی حُکمرانی ہے !

جو بہہ چُکا ہے لہُو رائیگاں نہ جائے گا
تمام دُنیا کے مظلوم لوگ کہتے ہیں
تمام دُنیا کے محکوم لوگ کہتے ہیں

لہو بغیر کوئی حکمراں نہ جائے گا !

لہو بدست چلو بے کسو، اُٹھو آؤ !

کسی کے واسطے ٹھہرے نہیں کبھی دن رات

یہی عمل کی گھڑی ہے یہی ہے فصلِ نجات

تمام دُنیا کے تشنہ لبو، اُٹھو، آؤ

طلوعِ صبحِ ازل سے زمین پیاسی ہے !

۱۶
۶
۷۲

پھر پکاریں اُسے

پھر پکاریں اُسے
آخری مرتبہ پھر پکاریں اُسے
اَن سُنی آہٹوں کے تعاقب میں ہم
تا کجا خواب تاروں کو بُنتے رہیں
اُس کے بے نقش پیکر کی تخلیق میں
اپنے رنگوں سے محروم ہوتے رہیں
اُس کے انصاف کی بے نشاں آس پر
خُون دیتے رہیں، ظُلم سہتے رہیں

ہر مُسافت کا آخر کوئی اَنت ہے، تا کجا طے کریں
بے جہت فاصلے، کارواں لڑکھڑاتے ہوئے
گردِ بادوں کو منزل بناتے ہوئے
زخم کھاتے ہوئے مُسکراتے ہوئے
زیرِ لب حمدیہ گیت گاتے ہوئے

آؤ مِل کر ذرا آج ڈھونڈیں اُسے
وہ جو کہتا ہے میں ہر جگہ ہوں، چلو آج دیکھیں اُسے
اس قدر زور سے اُس کو آواز دیں
آسماں اور زمیں ٹین کی چادروں کی طرح بج اُٹھیں،
اُس کو اخبار کے ہر وَرق پر جلی سُرخیوں سے لکھیں
"تم جہاں پر بھی ہو لوٹ آؤ، اگر تم نہ آئے
تو سجدوں کی بیمار بوڑھی روایت بکھر جائے گی"
ریڈیو اور ٹی۔وی پہ اُس سے کہیں
"تم اگر ہو تو آؤ، تمھارے لیے ہم گھروں میں دیے
اور دِلوں میں عقیدت کی شمعیں جلائے ہوئے منتظر ہیں
تمھارے بنا روشنی اپنے سائے سے ڈر جائے گی"
سب عبادت گھوں کے بلند اور چوبی منقّش دروں پر یہ نوٹس لکھیں

"تم اگر اپنے ان شیشہ خانوں سے باہر نہیں آؤ گے
تو سُنو۔
ہم بھی اندھے سفر پر نہیں جائیں گے ،
زخم کھائیں گے تو خود بھی خنجر کی صُورت نکل آئیں گے
حمدیہ گیت لب پر نہیں لائیں گے
آخری مرتبہ پھر پُکاریں اُسے

۴
۸
۷۲

اگر کوئی کہے

اگر کوئی کہے "میں نے ہوا کو مُٹھیوں میں بند دیکھا ہے
زمیں ساکن ہے، دُنیا اِک مثلث کی طرح ہے
روشنی آنکھوں کا دھوکا ہے"
تو مت کہنا وہ جُھوٹا ہے
اگر کوئی کہے یہ اَبر کا ٹکڑا حقیقت میں تمنّا کا ہیولیٰ ہے
یا اِک بھٹکا مُسافر ہے
سمندر کی یہ پہنائی، تلاطم کی توانائی
فقط دو بُوند پانی کی کہانی ہے، جو ہم تشنہ لبوں کی آنکھ کا
بے صرفہ جوہر ہے،
یہ سُورج اصل میں ناکام اُمیدوں کا ملبہ ہے
ستارے اَن کہی باتوں کے سائے میں، چمکتا چاند
ٹوٹی آرزوؤں کا جھروکا ہے

یہ پھولوں سے مہکتی شاخ قاتل کا اِرادہ ہے
تو مت کہنا وہ جھوٹا ہے؛

اُسے تم کِس طرح جھُوٹا کہو گے، عین ممکن ہے
وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اُس پہ ہی ایمان رکھتا ہو۔
تمھیں معلوم ہے ایمان وہ واحد حقیقت ہے
کہ جس کے ضمن میں پانچوں حِسیں بیکار ہوتی ہیں
تخیّل کی اُڑانیں نقطۂ پرکار ہوتی ہیں

اِسے دیکھو یہ میرا شہر ہے میرا ٹھکانہ ہے
یہاں وہ لوگ بستے ہیں جنھیں اپنی زمیں سے دُشمنوں کی باس آتی ہے
یہاں آزاد بندوں کو غلامی راس آتی ہے
یہاں بھُوکے کبھی نعرے کبھی گولی سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں
یہاں ڈاکو سرِ بازار آزادانہ پھرتے ہیں، محافظ مُنہ پہ
ڈاٹھے باندھ کر گھر سے نکلتے ہیں
یہاں رشتوں کے بندھن سُوت کے دھاگوں سے کچّے ہیں
کہ لوگوں نے تعلّق کے چمکتے دُودھ میں گندا لہُو گھولا

خود اپنے جسم کے ٹکڑوں پہ بابِ دُشمنی کھولا
جو حق کے واسطے بولا اُسے قدموں تلے رَولا ،
یہ جو چاروں طرف اِک سحر کا سا کارخانہ ہے
اسے دیکھو یہ میرا شہر ہے میرا ٹھکانہ ہے
یہ وہ بستی ہے جس میں ظلم کو انصاف کا نعم البدل
اور راہزن کو راہبر تسلیم کرتے ہیں
وہ گُلشن ہے جہاں چیخوں کا مَطلب خُوش نوائی ہے
پرندے ہر نئے صیّاد کی تکریم کرتے ہیں ۔
ہُنر مندوں کا ثانی ڈھونڈنا از بسکہ مُشکل ہے
مگر اِس شہر کی مُشکل زمانے سے انوکھی ہے
یہاں تو بے ہُنر لوگوں کا بھی ثانی نہیں مِلتا ۔

مُجھے بھی دیکھنے میں یہ تماشا جھُوٹ لگتا ہے
مگر یہ بے یقیں منظر
مرے ماحول اور تاریخ کا سب سے بڑا سچ ہے
یہ وہ سچ ہے کہ جس کا زہر میرے جسم میں دن رات پَلتا ہے
ہواؤں کی طرح دشتِ بدن میں رقص کرتا ہے

مجھے دیکھو میں ایسے شہر میں زندہ ہوں
جس میں زہر نے تریاق کا عہدہ سنبھالا ہے
میں اُس کو کس طرح جھوٹا کہوں
جس نے ہَوا کو مٹھیوں میں بند دیکھا ہے۔

۲۱
۹
۷۲

رات کس وقت ڈھلی

رات کِس وقت ڈھلی
کِس کو معلوم ہُوئی صُبحِ تمنّا کِس وقت
رات کِس وقت ڈھلی
کوئی اُس وقت نہ تھا میرے قریب
جب سرِ کوئے حبیب
شوق کی بات چلی
کیا خبر کیسے ہُوئی دل کی کہانی آخر
رات کِس وقت ڈھلی
کیا خبر کون اُفق سے اُبھری !
آنکھ کے طاق میں اُمید کی بے نام کرن
یوں چلی قافلۂ حرف وصدا کی خوُشبُو
جیسے مہکا ہو چمن

دل میں اس طرح کسی یاد نے کروٹ بدلی
جیسے ڈر جائے ہرن
سانس میں یوں کسی جذبے نے اُٹھائیں پلکیں
جیسے کِھلتی ہے کلی ،
رات کِس وقت ڈھلی ۔

رات کس وقت ڈھلی ، کِس کو خبر ، ڈوب گیا
کِس گھڑی بھیگتی آنکھوں میں ستارا غم کا
(کِس نے پایا ہے کنارا غم کا)
اِس قدر اوس پڑی کانپتے رُخساروں پر
اپنے چہرے پہ گلستاں کا گماں ہونے لگا
دشتِ دل سیلِ رواں ہونے لگا ۔
جب کبھی آنکھ اُٹھی تاروں پر
چاندنی ماند ہوئی خواب بنے انگارے
شوق نے دَرد کی دیواروں پر
نام کیا کیا نہ لکھے اور مٹائے ، پیارے
آئنہ خانۂ خواہش پہ ہر اک لمحۂ ہجر

صورتِ سنگ لگا
آ مرے دوست مجھے انگ لگا
میں مسِ خام ہوں کر دے مجھے سونے کی ڈلی
رات کس وقت ڈھلی

کتنے موسم تھے جنھیں تیرا پتہ مل نہ سکا
کتنی شامیں تھیں جنھیں رنگِ حنا مل نہ سکا
کتنے سجدے تھے جبینوں کی کمیں گاہوں میں
جن کو اے دوست ترا قبلۂ پا مل نہ سکا
میں بھی اِک سجدۂ گم راہ کی صورت تیرے
نقشِ پا ڈھونڈ کے مایوس پلٹ آیا ہوں
میں وہ مشعل ہوں کہ جو کوچہ کوراں میں جلی
وہ مسافر ہوں جسے مل نہ سکی تیری گلی
کیا خبر مجھ کو ہوئی صبحِ تمنا کس وقت
رات کس وقت ڈھلی

۱۴
۱۰
۷۲

گمشدہ عکس

کون ہیں یہ جو مُٹھیاں اپنی
کھوٹے سکوں سے بھر کے لائے ہیں
آنکھ کے بے وقار دامن میں
کون ہیں یہ جو لے کے آئے ہیں
بے ثمر خواب، بے ہُنر آنسو
بے جہت پاؤں، مضمحل بازو
اِک اَرب لوگ ہیں کہ سائے ہیں

اِتنے پتّھر اگر بہم ہو جائیں
رفعتِ کوہ آسمان لگے
اِتنے ذرّے اگر ہوں جمع کہیں
وسعتِ دشت بے نشان لگے

اِتنے تارے اگر چمکتے ہوں
ظرفِ خورشید اِک چراغ لگے
اِتنے غنچے اگر مہکتے ہوں
موسمِ زرد بے سراغ لگے

کون ہیں یہ جو رات دِن اپنی
گمشدہ بستیوں کے ملبے سے
بے عمل خواہشیں اُٹھاتے ہیں
کون ہیں یہ جو چیونٹیوں کی طرح
ٹوٹی قبروں میں گھر بناتے ہیں
کون ہیں یہ جو میرے چار طرف
چلتے پھرتے ہیں آتے جاتے ہیں

میں نے دیکھا تو جتنے چہرے تھے
ہو بہُو نین نقش میرے تھے

سُورج کی پہلی کِرن

سُن اے ہَوائے بے دلی
ابھی تو چشمِ تر میں اُن کی صُورتیں رواں دواں ہیں
جن کے سانس کی مہک میں جا چکی بہار کا نکھار ہے۔
کہ جن کے خواب کی چمک، پلک پلک بِکھرتی آرزو میں پائدار ہے۔
ابھی تو ان کی خاک کو زمین بھی نہیں ملی
سُن اے ہوائے بے دِلی
اگرچہ اس دیار میں ہر ایک سُو گئی رُتوں کی گُمشدہ
بہار کا فشار ہے، غبارِ انتظار ہے
مگر یہ زرد گھاٹیاں یہ کاروانِ بے نشاں
سفر کی انتہا نہیں
دُھواں دُھواں ہیں جسم وجاں، مگر زباں ہے گلفشاں
کہ دل ابھی مرا نہیں

نظر میں ہے وہ فصلِ گُل جو اَب تلک نہیں کھِلی
سُن اے ہَوائے بے دلی ۔

سُن اے ہوائے بے دلی
ہمیں اسی زمین سے، رفاقتِ یقین سے
ملے گی کشتِ آرزو کہ روشنی کی جستجو میں روشنی کا راز ہے
ہمارے اِردگرد کی ہر ایک شے سوال ہے
اِن اُنگلیوں کی پور پور صاحبِ کمال ہے
الوداع ___ الوداع اے بے دلی
کہ یہ ہماری دوستی کا نقطۂ زوال ہے ۔

۱۷
۲
۷۳

جنگی قیدیوں کے لیے ایک نظم

یہ کیسی رُت ہے
کہ آنگنوں میں تو پھُول کھِلتے ہیں اور آنکھوں میں
پچھلے موسم کے خُشک پتّے بِکھر رہے ہیں
گلاب چاروں طرف کھِلے ہیں
مگر دریچوں میں جانے والوں کی راہ تکتے اُداس چہرے
خزاں کی دہلیز پر کھڑے ہیں

ہَوا کے جھونکے سے کھڑکیوں کے سیاہ پردے جو سرسرائیں
تو ایسے لگتا ہے جیسے ہاتھوں نے چوڑیوں کے بجائے بچھو پہن لیے ہوں
خموش بچّے تہی نگاہوں سے اپنے ٹوٹے ہُوئے کھلونوں
کو دیکھتے ہیں تو لانے والوں کے خواب سائے
سکون نیندوں میں جاگتے ہیں

اُلجھتے بالوں میں پچھلی رُت کے لگائے پھُولوں کی سبز خُوشبو
شفیق ہاتھوں کو ڈھونڈتی ہے
بچھڑنے والوں کی یاد کانوں میں لڑکھڑاتی ہُوئی صداؤں کے جال بُنتی ہے
آس چُنتی ہے
دل کے اُجڑے ہُوئے چمن سے خیال ریزے
اُبھرتے سُورج کی سُرخ کرنوں کے تیز نیزے
جو کھڑکیوں کے دبیز شیشوں کو کاٹتے ہیں
تو جانے والوں کے خالی بستر ہر ایک منظر پہ پھیلتے ہیں۔
ضعیف ہونٹوں میں آرزو کے سفیر چلتے ہیں
اور ہاتھوں کی جھرّیوں سے گئے زمانے پُکارتے ہیں
اُجاڑ کمروں کی سنسناہٹ میں سانپ وہموں کے رینگتے ہیں۔

یہ کیسی رُت ہے
بہار آکر کھُلے کواڑوں کو کھٹکھٹاتی ہے
بے دِلی کی ہَوا دریچوں میں سَرسَراتی ہے
اور پیلے گلاب آنگن میں کھِل رہے ہیں
یہ کیسی رُت ہے!
کہ پانیوں میں تمام منظر گھِرے ہُوئے ہیں

مگر نگاہوں میں پیاس لکھی ہے
کیسا نشہ ہے جو سمندر سما گیا ہے ،
خمارِ غم کا لہُو کے صحرا میں دوڑتا ہے ۔

وطن کی مٹی سے دُور بیٹو
جو گھر ستائے تو یاد رکھنا
مفارقت کے طویل رستے میں تم اکیلے نہیں ہو
ہم بھی تمُھاری آہٹ کے ہم سَفر ہیں
تمام آنکھیں تمھارے قدموں کی منتظر ہیں ۔
تمام سینے تمُھارے گھر ہیں ۔

۲۳
۴
۷۳

ایک شہر کی کہانی

شجر چُپ چاپ
سڑکیں دُور تک
آنکھوں کی ساکت پتلیوں کی مثل خالی ہیں
گھروں کے بام و دَر مُبہم دُھندلکوں میں گھِرے ایسے کھڑے ہیں
جس طرح گہری خموشی جنگلوں کی شام میں اُترے
تو پتّے تک نہیں ہلتے
دریچہ بند کمروں میں کسی بے نام دہشت کے ہیولے
آہٹیں بن کر بھٹکتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے
شہر اِک صدیوں پُرانا مقبرہ ہے، جس میں
کب کے مر چکے لوگوں کے ٹوٹے استخواں
چمگادڑوں اور خُون کی پیاسی چڑیلوں کے سِوا کوئی نہیں رہتا۔

(۲)

سحر ہوتے ہی اس وحشت کدے کا رنگ بدلے گا
نئے اخبار، روشن سُرخیاں لے کر پُرانے ہوٹلوں کی
بے ثمر میزوں، دکانوں، دفتروں اور آنگنوں میں
صفحہ صفحہ ہو کے بکھریں گے،
درختوں کا تحیّر ریزہ ریزہ ہو کے ٹوٹے گا،
بسیں، کاریں، سکوٹر، آدمی
سیلاب کے پانی کی صُورت شہر کی سڑکوں پہ نکلیں گے،
(بس اِتنا فرق ہے سیلاب کا پانی
کناروں سے نِکلتا ہے تو پھر واپس نہیں آتا)
جہاں تک روشنی سُورج کی جائے گی،
مشینوں کی طرح سب لوگ اِس کے ساتھ جائیں گے
کہ یہ بستی حقیقت میں بڑا سا کارخانہ ہے
جہاں ہر شخص اِک خُود کار کل کی مثل چلتا ہے۔
گزُرتی شفٹ کے آخر سے اگلی شفٹ کے آغاز تک
اک وقفۂ موہوم ہے جس میں مشینیں
تیل پیتی ہیں پھر اپنی ہی طرح کی دُوسری
چھوٹی کلوں کی ساخت میں مشغول ہوتی ہیں،

کہ اس پتھر تسلسل کا اِسی میں آب و دانہ ہے
مشینیں آدمی ہیں اور دُنیا کارخانہ ہے

(۳)

سحر اور رات کی اس بے عمل مصروفیت میں شہر کی تاریخ بنتی ہے۔
سنیما گھر، کلب، ہوٹل، اَدب، اخلاق، شہرت اور سیاست کے
منافع بخش کاروبار چلتے ہیں
کوئی دیکھے تو سارا شہر جیسے فلم کی شوٹنگ میں کھویا ہے
ہدایت کار سے سیٹ پر کھڑے "شوقین چہروں" کی طرح
ہر شخص "اوکے" کی صدا کے سحر میں محصور ہے
جیسے "پیک اپ" کی گھڑی ہی منزلِ مقصود ہو۔
جیسے سب کچھ اس کہانی کے سوا بے سُود ہو۔

(۴)

خزاں پتّوں سے بوجھل ٹوٹتی شاخوں کے پہلو سے
نئی کلیاں نکلتی ہیں مناظر اپنے پیراہن بدلتے ہیں
سجیلے نوجواں بینر لیے سڑکوں پہ آتے ہیں
"ہمیں اِس علم کی حاجت نہیں جو آدمی کو کارخانے کے لیے
اِک فالتو پُرزہ بناتا ہے، ہمیں سچائی کے بھُولے ہُوئے قفلوں کی
کُنجی دو کہ ہم اس بے جہت صحرا میں اپنی رہگزر پائیں"

گولیاں چلتی ہیں، بینر نوجواں ہاتھوں کی مٹھی سے پھسلتے ہیں
بہت سے گھر ہمیشہ کے لیے اِک جا چکی خُوشبُو کو روتے ہیں
مگر بینر نہیں گرتے — مگر بینر نہیں گرتے
اگر اک ہاتھ کٹتا ہے تو لاکھوں ہاتھ اُس کے خُون سے
تخلیق ہوتے ہیں

مشینوں سے بھری بستی میں یہ واحد صدا ہے
جس کے ہونے سے یہاں انسان کی موجودگی کی آس زندہ ہے
اس اندھیرے — اس سمندر سے بڑے کالے اندھیرے میں
یہ اک روشن دیا — واحد دیا تابندہ ہے۔

۴
—
۷
—
۷۳

آخری شام

یہ مہ و سال جو ہم
روتے ہُوئے، ہنستے ہُوئے کاٹتے ہیں
حاصلِ عمرِ رواں جانتے ہیں
چشمِ خورشید کی تقویم میں اِک لمحۂ پرّاں کی طرح ہیں
کہ جسے اِک نظر دیکھو تو پھر آنکھ سے اوجھل ہو جائے۔

وہ تو پھر شام تھی
ان لاکھوں مہ و سال کے گرداب میں تنکے کی طرح بہتی ہُوئی شام جسے
روکتے روکتے دن رات میں ڈھل جاتا ہے
جیسے سیماب کہ مٹھی سے پھسل جاتا ہے
وہ عجب شام تھی لیکن جس کے
رینگتے سایوں کے پہلو میں زمانے گُم تھے

خُون میں ڈوبی ہُوئی ریت پہ بے گور و کفن
اُن شہیدوں کے بدن تھے کہ جنھیں
آسماں سینکڑوں صدیوں میں جنم دیتا ہے
اُن کے جلتے ہُوئے خیمے تھے جنھیں
اپنے دامن کی پنہ ، بابِ حرم دیتا ہے
وقت کا کام گزرنا ہے گزر جاتا ہے
کیسا مُنہ زور بھی طوفاں ہو اُتر جاتا ہے
وہ عجب شام تھی لیکن جس کا
ایک اِک لمحہ زمانوں پہ جہانگیر ہُوا ،
لوحِ تاریخ پہ جس کا ہر لفظ" ___ بولتے خُون سے تحریر ہُوا
اہلِ ایمان کی تقدیر ہُوا

آج تک گزُری نہیں
چشمِ خورشید کی تقویم میں اس رنگ کی شام
خُون سے لکھتا تھا اِک شخص وفا کا پیغام
ابنِ آدم کی ہر اِک نسل کے نام
اے حسینؑ ابنِ علی تجھ پہ سلام
اے حسینؑ ابنِ علی تجھ پہ سلام

گِلہ

گِلہ ہَوا سے نہیں ہے ہوا تو اندھی تھی
مگر وہ برگ کہ ٹوٹے تو پھر ہرے نہ ہُوئے
مگر وہ سر کہ جُھکے اور پھر کھڑے نہ ہُوئے
مگر وہ خواب کہ بکھرے تو بے نشاں ٹھہرے
مگر وہ ہاتھ کہ بچھڑے تو استخواں ٹھہرے
گِلہ ہَوا سے نہیں تندیٔ ہوا سے نہیں
ہنسی کے تیر چلاتی ہُوئی فضا سے نہیں
عدو کے سنگ سے اغیار کی جفا سے نہیں
گِلہ تو گرتے مکانوں کے بام و دَر سے ہے
گِلہ تو اپنے بکھرتے ہوئے سفر سے ہے

ہَوا کا کام تو چلنا ہے اس کو چلنا تھا
کوئی درخت گرے یار ہے، اُسے کیا ہے!

گِلہ تو اہلِ چمن کے دل و نظر سے ہے
خزاں کی دُھول میں لپٹے ہُوئے شجر سے ہے
گِلہ سحر سے نہیں رونقِ سحر سے ہے

۱۸
۲
۷۲

آخری بوسہ

مرے ہونٹوں پہ اُس کے آخری بوسے کی لذّت ثبت ہے
وہ اُس کا آخری بوسہ
جو مستقبل کے ہر اِک خوف سے آزاد
اِک روشن ستارا تھا
گزرتی رات کے ننگے بدن پر تِل کی صُورت قائم و دائم
ہمیشہ جاگنے والا ستارا
میں جسے اس آگ برساتے ہُوئے سُورج کے آگے
جگمگاتا دیکھ سکتا ہُوں۔

وہ اُس کا آخری بوسہ
جو اس نفرت بھری دُنیا میں
اِک خُوشبُو کا جھونکا تھا

بکھرتی پتّیوں میں موسمِ گُل کے اشارے کی طرح
اِک ڈولتی خُوشبو کا جھونکا
میں جیسے اس حبس کے کالے قفس کی تیلیوں سے
مُسکراتا دیکھ سکتا ہُوں۔

وہ اُس کا آخری بوسہ
جو اِن مرتی ہُوئی صدیوں میں
اِک بے اَنت لمحہ تھا
تلاطم میں کسی ساحل کی پہلی دید سا
انمول اور بے اَنت لمحہ
میں جیسے اشکوں کی اس دیوار میں
رخنے بناتا دیکھ سکتا ہوں
مرے ہونٹوں پہ اُس کے آخری بوسے کی لذّت ثبت ہے
وہ اُس کا آخری بوسہ جو میں اپنے بدن میں
سانس صُورت آتا جاتا دیکھ سکتا ہوں
لہُو کی خامشی میں سرسراتا دیکھ سکتا ہوں

۱۹
۲
۸۴

گواہی

اس سے پہلے کہ یہ ساون کی جھڑی تھم جائے
جتنے اقرار کے الفاظ ہیں کہہ دو مجھ سے
بھیگتے پیڑ ہیں میں ہوں، تم ہو
اِس برستے ہُوئے بادل کی طرح
لفظ اگر مُڑ کے نہ آئے بھی تو کیا!

بھیگتے پیڑ کسے جا کے گواہی دیں گے

۴
۸
۷۴

فشار
برزخ
اس پار
ساتواں در
ذرا پھر سے کہنا
سحر آثار
بارش کی آواز
اتنے خواب کہاں رکھوں گا
میرے بھی ہیں کچھ خواب
ہم اس کے ہیں